ماہنامہ
اکتوبر 2022ء

طلوعِ اسلام

لاہور
اشاعت کا اناسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی' حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے' اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

اکتوبر 2022ء
جلد 75 | شمارہ نمبر 10

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: مذہبی حکومت یا قرآنی ریاست؟	ادارہ	4
درسِ قرآن (سورۃ یونس آیات 18 سے 23)	پرویز علیہ الرحمۃ	14
یہودیوں کی حکومت کیسے بن گئی؟	ادارہ	34
نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر	خواجہ ازہر عباس، کراچی	39
کیا شوہر اپنی بیوی کو بدنی سزا دے سکتا ہے؟	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	51

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool) Episode No. 11	58

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور — اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

مذہبی حکومت یا قرآنی ریاست؟

طلوع اسلام اس ضمن میں 1948ء سے برابر لکھتا چلا آ رہا ہے۔ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے قارئین یہ کہہ اٹھتے ہوں گے کہ ایک ہی راگ سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں۔ مگر ہمارا جواب یہ ہے کہ جب تک ممکن ہے ہم اسے مسلسل دہرائے چلے جائیں گے کیونکہ ہم اسے اپنا دینی وملی تقاضا سمجھتے ہیں۔ اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ سیکولر پاکستان کو قائداعظم علیہ الرحمۃ کے ''خواب'' سے تعبیر کیا جانے لگا ہے۔ للہ العجب! قائداعظمؒ جس طرح سیکولرازم کے خلاف تھے اسی طرح تھیا کریسی کے بھی خلاف تھے۔ اس لئے کہ تھیا کریٹک سٹیٹ اور اسلامک سٹیٹ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ قائداعظمؒ کا ایک بیان روزنامہ انقلاب لاہور کی 23 مارچ 1932ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، جس میں انہوں نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

> قائداعظمؒ جس طرح سیکولرازم کے خلاف تھے اسی طرح تھیا کریسی کے بھی خلاف تھے۔ اس لئے کہ تھیا کریٹک سٹیٹ اور اسلامک سٹیٹ ایک دوسرے کی ضد ہیں

> تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات وجذبات کے ایک ایسے قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

انہوں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس قسم کا انقلاب بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی ہوگا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ ''اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسولؐ اللہ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ۔۔ حسبنا

کتاب اللہ ''ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔'' (خطبات اقبالؒ)۔

قائداعظمؒ نے 5 فروری 1938ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے نوجوان طالب علموں سے کہا تھا کہ ''مسلم لیگ نے ایک کام تو کر دیا اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں............ رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اس نے تمہیں اس ناپسندیدہ عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔ (تقاریر قائداعظمؒ حصہ اول، ص 48)

> جب ہمارے پاس قرآن کریم ایسی مشعل ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے؟

اس سے ان کی مراد، تھیا کریسی کی مخالفت تھی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے 11 اپریل 1942ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ جنگ کر رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین تھیا کریسی نہیں۔ ہم تھیا کریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔
>
> (تقاریر جناحؒ، شائع کردہ شیخ محمد اشرف، جلد دوم، ص 386)

وہ تھیا کریٹک سٹیٹ نہیں بلکہ اسلامک سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اس حقیقت کو انہوں نے حیدرآباد (دکن) میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کو 1942ء کو انٹرویو دیتے ہوئے ایسے جامع انداز میں سمٹا کر بیان کر دیا تھا جس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ انہوں نے فرمایا تھا:

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام واصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔
>
> (اورینٹ پریس بحوالہ روزنامہ انقلاب، لاہور، مورخہ 8 فروری 1942ء)

سوال یہ ہے کہ قائداعظم اور مخالفین مطالبہ پاکستان کے مابین جنگ کس بات پر ہوئی تھی؟ وہ جنگ صرف اس بنا پر لڑی گئی تھی کہ قائداعظم اسلامی ریاست متشکل کرنا چاہتے تھے اور مخالفین پاکستان (ہندو اور مسلمان نیشنلسٹ) سیکولر سٹیٹ کے حامی تھے۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی وسعت طلب ہے۔ چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ قائداعظم نے جب مذہب (دین) کی بنیادوں پر مملکت قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا تو (اس زمانے کے) کانگریس کے ایک نامور لیڈر، مسٹر بھولا بھائی

ڈیسائی نے ایوان اسمبلی میں (جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے) پکار کر کہا:

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظام حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام، یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور خوامخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظام حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصر حاضر میں بہترین نظام حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد، معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز، 5 ستمبر 1938ء)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا تھا:

حکومت الٰہیہ کا تصور ایک داستان پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعلِ عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔

(ہندوستان ٹائمز، 14 نومبر 1939)

1940ء میں جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر گاندھی نے کہا تھا:

.اگر مذہب کو علیٰ حالہ رہنے دیا جائے یعنی ایک نج کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہ عمل بھی مشترک ہو۔

(ہندوستان ٹائمز، 9 جون 1940)

اس رو میں مسٹر گاندھی نے 1946ء میں لکھا تھا:

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ؟ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے............ مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ (ہریجن، 9 دسمبر 1946)

مسٹر گاندھی کا یہ ردعمل، قائداعظم کے اس خط کا نتیجہ تھا جو انہوں نے اول الذکر کو یکم جنوری 1940ء کو لکھا تھا۔ اس میں

انہوں نے (مسٹر گاندھی) سے کہا تھا:

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کون سی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح؟ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے (لہٰذا' مذہب اور سیاست' دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے) آپ تمدنی' معاشی' سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو انسانی معاملات سے واسطہ نہیں' میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ زندگی انسانی نہیں' محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔ (تقاریر جناحؒ' حصہ اول' ص: 139-140)۔

' یہاں کا ہندو اس لئے بھی خائف ہوسکتا تھا کہ اب یہاں جو مسلمانوں کی حکومت قائم ہو رہی ہے تو ماضی کی تاریخ کو یہاں بھی دہرایا جائے گا۔ ان تاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے قائداعظمؒ نے اپنی تقریر میں ہندوؤں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہوگا

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قائداعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اسلامی مملکت وہ ہے جس میں قرآن عظیم کی حکمرانی ہو۔ انہوں نے قرآن مجید کی عظمت اور جامعیت کا کسی ایک بیان میں ذکر نہیں کیا' وہ پوری تحریک پاکستان کے دوران اس حقیقت کو دہراتے رہی مثلاً اپریل 1943ء کا ذکر ہے۔ صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائداعظمؒ سے ایک پیغام کے لئے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

تم نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں جب کہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہنمائی اور بصیرت افروزی کے لئے کافی ہے۔ وہ پیغام ہے خدا کی کتاب عظیم' قرآن کریم۔ (تقاریر' جلد اول' ص:516)۔

13 نومبر 1939ء کو آپ نے قوم کے نام عید کا پیغام نشر فرمایا۔ اس زمانے میں ملک میں ہنگامے اور فساد ہو رہے تھے۔ آپ نے قوم سے کہا:

جب ہمارے پاس قرآن کریم ایسی مشعل ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے؟ (تقاریر' جلد اوّل' ص:108)۔

دسمبر 1943ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے خود ہی یہ سوال اٹھایا:

> وہ کون سا رشتہ ہے۔ جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا:

> وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی عظیم کتاب، قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔۔۔۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسولؐ فلہٰذا ایک قوم۔ (تقاریر، جلد دوم، ص ۵۰)۔

انہوں نے 1945ء میں، ملت کے نام عید کے پیغام میں ایک ایسی حقیقت کشا بات کہی جس پر نگہِ بصیرت ہمیشہ وجد کرتی رہے گی۔ آپ نے فرمایا:

> اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مورخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''بحر اٹلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطہ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اسکا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔''

اس کے بعد قائد اعظمؒ فرماتے ہیں:

> اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطہ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی تقاریب ہوں یا روزمرہ کے معمولات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا، عام اخلاقیات ہوں یا جرائم، دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت نہیں)۔ (تقاریر، جلد دوم، ص:300)۔

حیدر آباد (دکن) کے جس انٹرویو کا ذکر پہلے آ چکا ہے، اس میں جب طلباء نے یہ سوال کیا کہ ''مذہب اور مذہبی حکومت

کے لوازم کیا ہیں؟'' تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا:

> جب میں انگریزی زبان میں مذہب Religion کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کی رو سے' میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی' سیاسی ہو یا معاشی' غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

انہوں نے اپنی اس پکار کو اس شدومد سے دہرایا کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اس سے واقف ہو گیا کہ قائداعظمؒ کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے ہیں۔

اب آیئے قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کی طرف' جسے یہ ترپ کے پتے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور جس پر محترم جسٹس محمد منیر صاحب نے بھی اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھی اور اتنا کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے' بلکہ یہاں تک کہنے میں بھی کچھ باک نہیں سمجھا کہ انہوں نے دوقومی نظریہ کو بھی ختم کر دیا تھا۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ انہوں نے اسلامی مملکت کے تصور کی نفی کر دی تھی' بلکہ سرے سے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا تھا جس پر تقسیم ہند کی عمارت استوار ہوئی تھی اس تقریر کے سلسلہ میں بات یوں ہوئی کہ جب قائداعظمؒ کو پاکستان کی پہلی مجلس آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے (11 اگست 1947ء کو) اس مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تقریر فرمائی۔ اس میں انہوں نے پہلے' قبل از تقسیم کے ہندوستان کے کوائف وحوادث پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر باہمی عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ وہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں' اس لئے وہاں ہمیشہ مسلمانوں کا خون خرابہ ہوتا تھا۔۔۔ پاکستان میں صورت حال اس کے برعکس ہو گی۔ یہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے اور ہندو اقلیت میں' اس لئے ہندوؤں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اب یہاں ان

> جس شخصیت کی دس سالہ (تحریک پاکستان کی) زندگی اور اس دوران میں اس کے صدہا صفحات پر مشتمل بیانات' تقاریر' خطابات ہمارے سامنے ہوں' اس کی طرف ان نتائج کو منسوب کرنا جس قدر زیادتی ہے' اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

کے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو کچھ وہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ویسے بھی ہندو مورخوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کا ایسا بھیانک اور دہشت انگیز نقشہ کھینچ رکھا ہے جس سے ہندو عوام خوف و ہراس سے کانپ اٹھتے ہیں۔

بنابریں یہاں کا ہندو اس لئے بھی خائف ہوسکتا تھا کہ اب یہاں جو مسلمانوں کی حکومت قائم ہو رہی ہے تو ماضی کی تاریخ کو یہاں بھی دہرایا جائے گا۔ ان تاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے قائداعظمؒ نے اپنی تقریر میں ہندوؤں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہوگا۔ انہوں نے جملہ اہلِ پاکستان کو مخاطب کر کے فرمایا:

> ۔۔۔تم آزاد ہو، تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں، یا مملکت پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں۔ تمہاری ذات یا مسلک کچھ بھی ہو، اس کا امورِ مملکت سے کچھ تعلق نہیں ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ (اور تو اور) انگلستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہاں عیسائیوں ہی کے دو فرقوں۔۔۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ۔۔۔ میں کس قدر کشت و خون ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس مملکت نے، اپنی کامل ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے رفتہ رفتہ مناقشات کو مٹا دیا اور ''اب تم پورے انصاف سے کہہ سکتے ہو کہ وہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نہیں، بلکہ ایک مملکت کے شہری بستے ہیں۔'' اسی طرح:

> میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہئے کہ ایک وقت کے بعد یہاں نہ ہندو، ہندو رہے گا، نہ مسلمان، مسلمان۔۔۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں، کیونکہ وہ ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے۔ ایسا، ان سب کے پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے، سیاسی نقطۂ نگاہ سے ہوگا۔

یہ ہیں قائداعظمؒ کے وہ الفاظ جنہیں سپر بنا کر یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تشکیل پاکستان کے فوری بعد دو قومی نظریہ کو بھی خیر باد کہہ دیا تھا اور اسلامی مملکت کے تصور کی تردید کر کے اسے سیکولر بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اگر قائداعظمؒ کہیں مریخ سے ٹپکے ہوتے اور انہوں نے پہلے پہل یہ الفاظ کہے ہوتے تو اس تقریر سے اس قسم کے استنباط کا شائبہ ہوسکتا تھا۔ لیکن جس شخصیت کی دس سالہ (تحریک پاکستان کی) زندگی اور اس دوران میں اس کے صدہا صفحات پر مشتمل بیانات، تقاریر، خطابات ہمارے سامنے ہوں، اس کی طرف ان نتائج کو منسوب کرنا جس قدر زیادتی ہے، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جب ان لوگوں سے اس دلیل کا جواب نہیں بن پڑتا تو وہ (نہایت دیدہ دلیری سے) کہہ دیتے ہیں کہ بے شک قائداعظمؒ دس سال تک یہ دعویٰ کرتے رہے لیکن وہ درحقیقت ایک وکیلانہ حربہ تھا جسے انہوں نے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ جب کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہوگیا تو اس حربہ کی ضرورت نہ رہی۔ ایسا کہنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ وہ یہ کچھ کس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ ہم بربنائے عقیدت نہیں کہتے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص قائداعظمؒ کے کیریکٹر کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، وہ ان کے خلاف اس قسم کے الزام عائد کرنے کی جرأت کبھی نہیں کرسکتا۔ حق گوئی اور بے باکی ان کے کردار کی ایسی

خصوصیات تھیں، جس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک کو تھا۔ لندن ٹائمز نے ان کی وفات پر لکھا تھا:

> قائداعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونے کے طور پر پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ لچک نہیں تھی جو انگریزوں کے نزدیک، ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔

قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے جب مجلس آئین ساز سے خطاب کیا تھا تو ملک کے حالات کیا تھے۔ (جیسا کہ محترم جسٹس نے خود اپنی کتاب میں تسلیم کیا ہے) تقسیم ہند کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ اس سے وہاں کے مسلمانوں کے دل میں خوف و دہشت کے ایسے جذبات ابھرے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ پاکستان میں آ کر پناہ لے لیں۔ لیکن ان وحشی درندوں نے ان نہتے قافلوں کو بھی نہ چھوڑا۔ راستہ بھر قتل و غارتگری کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ان کی نوجوان لڑکیوں کو ہزاروں کی تعداد میں چھین جھپٹ کر لے گئے۔ ان کے معصوم بچوں کو نیزوں کی انیوں پر اچھالا گیا اور تو اور دلی سے جو گاڑیاں خود حکومت کے عملہ کو لے کر روانہ ہوئیں (میں بھی انہیں میں شامل تھا) یہاں پہنچنے پر ان میں سے زندہ انسانوں کی بجائے لاشوں کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان وحشیانہ مظالم کا ردعمل پاکستان کے بعض حصوں میں بھی ہوا اور اس سے یہاں کے غیر مسلم باشندوں (بالخصوص ہندوؤں) کے دل میں خوف و ہراس، بے اعتمادی اور بے یقینی کے وساوس پیدا ہوئے۔ آپ سوچئے کہ ایک ایسی مملکت جس کی عمر ابھی ایک دن کی بھی نہ ہوئی ہو اس قسم کے لرزہ خیز حالات سے دوچار ہو۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کے پاس (ابھی) نہ اپنی فوج ہو نہ اسلحہ، نہ سامان ہو نہ پیسہ، تو اس کے سربراہ کے دل پر اس سے کیا نہ گزرتی ہوگی؟ اس کے ساتھ اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ پاکستان کے اندر خود ایسے عناصر موجود تھے جو ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہے تھے، اور دوسری طرف انہیں اشتعال بھی دلا رہے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں بیان کر کے وہاں کے مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ کو تیز سے تیز تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے لئے نہایت ضروری تھا کہ یہاں غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں قائداعظمؒ کو پاکستان میں پہلی تقریر کرنی پڑی۔ قائداعظمؒ بڑی متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ وہ عام طور پر جذبات سے مغلوب نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن جن حالات سے اس وقت ملک دوچار تھا اور اتنی عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ اس مملکت پر آ پڑا تھا، اس کے سربراہ کا ان سے متاثر ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اسی قسم کی حفاظت ملے گی جیسے مسلمانوں کو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن (ہمیں اعتراف ہے کہ وہ اپنے معمول

کے خلاف) شدت جذبات میں الفاظ کے انتخاب میں کما حقہٗ احتیاط نہ برت سکے۔ بایں ہمہ' ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ جس نظریہ کی رو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریز سے جنگ کر کے پاکستان حاصل کیا تھا وہ اسے پہلے ہی دن نذر آتش کر دیں گے' بڑی زیادتی ہے۔ کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کرے گا۔

آیئے ہم لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھیں کہ قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا مفہوم خود غیر مسلم اقلیتیں کیا سمجھتی تھیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ اس سے قائداعظمؒ مسلموں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا اعلان کر کے سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے' یا یہ کہ اس سے مقصود غیر مسلم اقلیتوں کا تحفظ تھا؟...... مسٹر جوشوا فضل الدین ایک مشہور مسیحی لیڈر تھے (ان کا چند سال پہلے ادھر انتقال ہوا ہے) جب صدر ایوب (مرحوم) نے لا کمیشن کا تقرر کیا تو مسٹر جوشوا نے اس سوال پر بحث کی تھی کہ مجوزہ آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا۔ جس کا عنوان ۔۔ Rationale of Pakistan Constitution تھا۔ اس میں انہوں نے پہلے یہ واضح کیا تھا کہ 1940ء کی قرارداد پاکستان کی رو سے مملکت پاکستان کے دو بنیادی ستون ہیں۔ یعنی......

1۔ مملکت پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہوگی۔ یہی وہ قدر مشترک ہے جو مشرقی اور مغربی بازوؤں میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔

اس کے بعد مسٹر جوشوا نے کہا تھا کہ مجوزہ آئین کی یہ دونوں شرائط پوری کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد انہوں نے قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء (اور اس کے ساتھ 14 اگست 1947ء) کی تقریر کے اقتباسات دے کر یہ کہا تھا کہ ان کی تعبیر میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نہ ہندو' ہندو ہے۔ نہ مسلمان' مسلمان۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو جس کا لازمی نتیجہ سیکولر انداز حکومت ہو جائے وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

> . یہ کہنا کہ تخلیق پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے ۔۔۔۔ جو خود اس پاکستان کے خالق تھے ۔۔۔ اپنی پہلی ہی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہے کہ اس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی' بالکل پاگل پن ہے۔ قائداعظمؒ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلا لحاظ مذہب و ملت ہر ایک کو مساوی حقوقِ شہریت حاصل ہوں گی۔

اس کے بعد ہمیں صرف اتنا اور کہنا ہے کہ اگر یہ تقریر قائداعظمؒ کی زندگی کی آخری تقریر ہوتی تو پھر بھی اس مغالطہ آفرینی کی گنجائش نکل سکتی تھی کہ وہ جو کچھ دس سال تک کہتے رہے تھے' آخر میں وہ اس سے تائب ہو گئے تھے۔ اس لئے اب سند ان کی آخری تقریر ہی ہو سکتی ہے۔ حسن اتفاق ہے کہ قائداعظمؒ اس کے بعد بھی ایک سال تک زندہ رہے۔ اور (اگرچہ ان کا یہ تمام عرصہ انتہائی نازک بیماری کے عالم میں گزرا لیکن بایں ہمہ) انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں پھر اس کی وضاحت کر دی کہ پاکستان کس قسم کی سٹیٹ ہوگی۔ انہوں نے فروری 1948ء میں' اہل امریکہ کے نام جو پیغام براڈ کاسٹ

کیا تھا اس کے شروع میں کہا تھا:

مملکت پاکستان، جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین نصب العین کا ایک حد تک حصول ہے، 15 اگست 1947ء کو وجود میں آ گئی تھی۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامک سٹیٹ اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، 63)۔

قائداعظمؒ نے اسی ماہ (فروری 1948ء میں) آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں فرمایا تھا:

مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ان کے درمیان مملکت ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرون ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال ابھرے گا وہ یہ ہوگا کہ (ایسی مملکت کا قیام) کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں، جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدت حکومت کس طرح ممکن ہوگی میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا جو یہ ہے:

ایسا، ہمارے ایمان کی رو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر، ایمان اپنے آپ پر، ایمان مستقبل پر، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہ سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا:

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمدؐ رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جن میں حقوق، شرف واحترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں، ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم وروایات ہم اپنے اسالیب فکر، نقطہ نگاہ اور احساسِ دروں کے مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص 58)۔

اگر ہم مملکت پاکستان کی بنیاد قرآن مجید پر رکھتے اور اس کی تعلیم کو عام کرتے جاتے تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جاتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم کے رشتے، امت واحدہ ہونے کے اصول ونظریہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور وطن اور نسل کی تفریق کے تصور کو عام ہونے دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ تشتت وافتراق تھا۔

''ایمان، ایمان خدا پر، ایمان اپنے آپ پر، ایمان اپنے مستقبل پر'' یہ تھی وہ اساسِ محکم جس پر مملکت پاکستان کی یہ رفیع و عظیم عمارت استوار ہوئی تھی۔

ہم پوچھنا چاہتے ہیں ارباب بصیرت سے کہ سیکولر سٹیٹ کا مدعی کیا اس قسم کے نظریات پیش کرے گا؟ اس موضوع پر کہنے کو تو ابھی بہت کچھ اور بھی کہا جا سکتا ہے اور طلوع اسلام گذشتہ نصف صدی سے اس پر لکھتا چلا آ رہا ہے...... لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

پرویز علیہ الرحمۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

درسِ قرآن

سورۃ یونس پانچواں باب (آیات 18 سے 23 تک)

(یہ تحریر پرویز صاحب کے ایک درسِ قرآن کی تسوید ہے جو کہ اگست 1973ء میں دیا گیا۔ ان دنوں پاکستان میں سیلاب آیا ہوا تھا جس کے باعث یہ درس سیلاب کی تباہ کاریوں کے موضوع کی نذر ہو گیا۔ اس درس کی Transcription کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ گذشتہ آدھی صدی سے ہم ایک طرح کے ''جحیم'' میں اٹکے ہوئے ہیں۔ آپ کے لئے حاضرِ خدمت ہے۔ مدیر)

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا
لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ 18 وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً
فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ 19 وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ
مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ 20 وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ
ضَرَّاۗءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ 21 هُوَ الَّذِيْ
يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ
عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ
اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ 22 فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ
اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ 23

1973ء میں پاکستان کی تاریخ کے ایک تباہ کن سیلاب پر علامہ پرویز کی دل گرفتگی

عزیزانِ من! آج اگست 1973ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی 18 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔ (10:18)

لیکن آج میری صورت یہ ہے کہ سینے میں جذبات کا اتنا تلاطم ہے کہ اس میں میں دیکھتا ہوں کہ فکر کے پاؤں کہیں ٹکنے ہی نہیں پا رہے۔ میں طبعاً کافی سہار اور برداشت کا انسان ہوں' ذاتی حوادث اور مصائب کا تو کبھی میں ذکر نہیں کیا کرتا۔ اجتماعی اور ملی حوادث کی کیفیت یہ' 12-1911 میں ورلڈ وار ہوئی۔ اگرچہ اس زمانے میں عمر میری چھوٹی سی تھی لیکن

احساسات اسی وقت سے بیدار ہو چکے تھے۔ وہاں سے یہ جواس ملتِ مرحومہ پر حوادث کی یلغار دیکھنی شروع کی تو گویا ساٹھ برس ہو گئے اس واقعہ کو۔ مسلسل اور پیہم اسے انہی آفات کا شکار پایا۔ یہ دور ہی وہ ہے جس میں سے ہم گذر رہے ہیں کہ اس امت پر تو خوشیوں کا دن شاید ہی کوئی آتا ہو اس کی تو عید بھی غم میں گذرتی ہے۔ لیکن ان چیزوں کو برداشت کیے چلا آ رہا تھا۔ گذشتہ دو سال سے جو کچھ ہم پر بیت رہی ہے وہ ایسا تھا کہ اس کا ایک مجموعی تاثر آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتا چلا گیا۔ یہ مملکت جیسا کہ میں کئی بار عرض کر چکا ہوں میرے ایمان کے تقاضے کی تکمیل کا ذریعہ تھی۔ آدھی مملکت چلی گئی' باقی آدھا حصہ جو ملک کا رہ گیا اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جا سکے کہ اس حصہءِ ملک میں بھی شاید ہی کوئی فرد ہوگا جو اطمینان کی نیند سو سکتا ہو۔ یہ آج کی حالت ہے اور مستقبل اس سے بھی تاریک تر نظر آتا ہے۔ لیکن وہ جو اس نے کہا تھا کہ:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

یہ مرگِ ناگہانی اس سیلاب کی شکل میں ہم پر مسلط ہو گئی۔ ایسا عالمگیر سیلاب کہتے ہیں تاریخ میں کہیں اِدھر نہیں آیا۔ آگ سے بھی تباہی ہوتی ہے لیکن آگ سے تو اس کے رخ سے ذرا پیچھے انسان ہٹ جائے تو محفوظ ہو جاتا ہے۔ زلزلے کی تباہی بڑی ہی شدید ہوتی ہے لیکن وہ ایک مقام کی تباہی ہوتی ہے۔ اس تباہی کی تو کیفیت یہ ہے کہ یوں کہیے کہ جہاں سے مغربی پاکستان کا میدانی علاقہ شروع ہوتا ہے وہاں سے لے کے جہاں یہ علاقہ ختم ہوتا ہے میدانی علاقہ دریاؤں کے پاس کو کہا جاتا ہے۔ سارا ملک پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور ہر صبح جو نئی خبریں آتی ہیں وہ پہلی خبروں سے بھی زیادہ اندوہ ناک اور افسردہ کرنے والی ہوتی ہیں۔ ابھی کچھ اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا کہ اس تباہی کی شدت اور وسعت کتنی زیادہ ہے۔ لیکن ایک چیز جس سے میرے ان زخموں پر نمک چھڑکا جاتا ہے وہ اور ہے۔ ان علاقوں کے لوگ تباہ اور برباد ہو رہے ہیں بے کس بے بس مجبور۔ اور ان کے متعلق کہا یہ جا رہا ہے کہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا مل رہی ہے' یوں ان گناہوں کی پاداش میں یہ کچھ ہو رہا ہے۔ دنیا تو ان کی یوں تباہ ہوئی تھی اور ان مرنے والوں کے کان میں اگر آخری لفظ یہ ڈالا جائے کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے تمہارے گناہوں کے بدلے میں ہو رہا ہے گویا بڑے ہی گناہگار تھے تم جس کی وجہ سے یہ سزا پا رہے ہو۔ سوچو تو سہی کہ ان کے اوپر کیا بیتتی ہوگی یہ سن کر۔ کوئی نہیں اتنا یہ سوچتا کہ کیا یہ سارے گناہ شکر گڑھ سیالکوٹ سے لے کے اور درمیانی علاقے لاہور سے جو اس پار شاہدرہ پھر شرق پور شیخوپورہ اور یوں گذرتے ہوئے آگے پھر سکھر اور دادو اور یہ۔ سارے ملک کے گناہ جو تھے وہ سمٹ کے ان علاقوں کے لوگوں کے حصے میں آئے تھے۔ راوی کے اس پار شاہدرہ والے جتنے تھے سارے فاسق اور فاجر اور ہم بڑے متقی اور پرہیزگار۔ کیونکہ ان پر تو یہ عذاب آیا ہم پر تو عذاب یہ نہیں آیا۔ سوچئے ذرا کہ یہ بات کہاں پہنچتی ہے ان پر کیا بیتتی ہے جن سے یہ کہا جاتا ہے۔ کیا فرق ہے ان میں اور ہم میں۔ وہ راوی اگر اپنا رخ شرق پور اور شیخوپورہ کی طرف نہ کر لیتا اور ادھر (لاہور) کا بند ٹوٹ جاتا ہم بھی اسی عذاب کے اندر مبتلا ہو جاتے۔ تو آج جو ہم بچے ہوئے ہیں تو کیا ہم اپنی نیکیوں کی وجہ سے بچے ہوئے ہیں؟ اور وہ جو تباہ ہوئے ہیں وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے تباہ ہوئے ہیں؟۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ چیز کیا ہے۔ ٹھیک ہے الفاظ تو یہ استعمال ہوتے ہیں ان کے مفہوم غلط ہیں۔ اور اس میں ایک سازش ہے۔ یہ طبعی حوادث ارضی اور سماوی یہ

زمین کے رہنے والوں کے گناہوں کی وجہ سے نہیں آتے۔ یہ طبعی قوانین ہیں فطرت کے' یہ ان کے مطابق سب کچھ رونما ہوتا ہے۔ سیلاب کیا ہے۔ عام Average اور اوسط سے زیادہ بارشیں خاص علاقے میں ہوئیں اوپر کا علاقہ جنہیں کہا جاتا ہے' وہ پانی حدِ اعتدال سے بڑھ گیا' دریاؤں کے سواحل میں اس کی سمائی نہ ہوئی وہ بپھر کر ادھر اُدھر پھیل گیا۔ یہی ہے نا جسے سیلاب کہا جاتا ہے۔ اس میں ان گناہوں کا کیا دخل ہے۔

باشعور قومیں اس قسم کی تباہ کاریوں کا علاج طبعی قانون کے تحت کرتی ہیں

دنیا کے جن ممالک نے ان چیزوں کا انتظام کر رکھا ہے ان کے ہاں بارشیں برستی ہیں سیلاب بھی آتے ہیں۔ ابھی میں عرض کروں گا تباہیاں نہیں آتیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ ہالینڈ کا ملک سطحِ سمندر سے نیچے ہے' سمندر کے ساتھ واقع ہوا ہے اس کی سطح سے نیچے ہے۔ سمندر کی' کسی جھیل کی دریا کی نہیں۔ انہوں نے بند باندھا ہوا ہے انہوں نے زمین ہی اپنی سمندر سے کھینچ کے لی تھی۔ سوچئے تو سہی کہ اس قسم کے بند کے نیچے جو زندگی گذار رہے ہوں کس قدر خطرہ مول لے رکھا ہے۔ لیکن ایک قطرہ پانی کا اس میں سے نہیں ٹپکتا۔ یہ نہیں کہ ہالینڈ کے رہنے والے ہماری اصطلاح کے مطابق بڑے نیک واقع ہوئے ہیں۔ طبعی حوادث' ان حوادث کے متعلق تو قرآن نے یہ کہا ہے کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا یہ شے کیا ہے' یہ بارش اور بارش کا پانی' وہ تو کہتا ہے کہ ارض وسما کے اندر یہ نظام جو ہے اس کے اندر جتنی قوتیں ہیں ہم نے انسان کے تابع فرمان کر رکھا ہے ان کو' مسخر کر رکھا ہے اپنے قانون کی زنجیروں میں۔ جو قوم بھی ان قوانین کا علم رکھتی ہے اور اس کے مطابق عمل کرتی ہے یہ پانی یہ ہوائیں یہ جھکڑ یہ زلزلے یہ آندھیاں یہ سارے مسخر ہوتے ہیں۔ جاپان کی سرزمین' ہر آئے دن وہاں زلزلے آتے تھے۔ زمین کے نیچے جو زلزلہ آتا ہے اس پہ تو اختیار نہیں تھا۔ زمین کے اوپر تباہی مچتی تھی نا۔ مدت العمر وہ تجربے کرتے رہے اور سوچتے رہے اور اس کے بعد ایسے مکانات انہوں نے ایجاد کر لیے کہ زلزلے آتے ہیں اور کوئی مکان گرتا ہی نہیں۔ وہ ان لوگوں کے مقابل میں زیادہ نیک نہیں ہیں کہ جن کے ہاں زلزلے تباہیاں اب بھی مچا رہے ہیں۔ جسے تباہی کہا جاتا ہے وہ ہوتی کیا ہے۔ یہی سیلاب کا پانی جہاں سے آیا تھا وہ پہاڑوں سے گذرتا میدانوں سے گذرتا جنگلوں سے گذرتا لیکن ان علاقوں سے گذرتا جن میں کوئی انسان نہیں بستا تھا۔ تو گذر کے راستے اپنے راستے پہ چلتا اور چلتا چلتا سمندر میں جا گرتا' یہ تباہی تو ایک طرف رہی کسی ایک فرد کو بھی یہ ہلاک نہ کر سکتا۔

قدرت نے تو کائناتی قوتوں کو انسان کے لیے مسخر کر رکھا ہے

تباہی اس وقت کہی جاتی ہے جب اس کی زد میں انسان آتا ہے۔ اور انسان وہ اس کی زد میں آتا ہے جس کے پاس حفاظتی تدبیر نہیں ہوتی۔ اسی کو تباہی کہتے ہیں نا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سیلاب کی تباہی تمام تباہیوں سے زیادہ عالمگیر اور شدید ہے۔ اور اسی لیے قرآنِ کریم نے جن تباہیوں کا ذکر کیا ہے اس میں سب سے پہلے طوفان ہی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس طوفان سے بچنے کی تدبیر کیا بتائی۔ حضرتِ نوحؑ اور ان کے ساتھی جو تھے ان کے مومن اور نیک ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہوسکتا۔

یہ محض نیک ہونا اگر ان طوفانوں سے بچا سکتا تو انہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کہا یہ گیا حضرتِ نوحؑ پیغمبر سے کہ طوفان آنے والا ہے کشتی بناؤ اس سے بچ جاؤ گے۔ ایک پیغمبر اور اس کی اولیں امت جو ایمان اور عملِ صالح کے مجسمے ہوتے ہیں وہ بھی اگر اس حادثے سے اس طوفان سے بچے ہیں حفاظتی تدبیر کی رو سے بچے ہیں۔ حفاظتی تدابیر نہ ہوں تو یہ تباہیاں لاتے ہیں حوادث' حفاظتی تدابیر موجود ہوں تو یہ کوئی تباہی نہیں لاتے۔ قرآن نے یہ واقعہ ذکر کر کے بتا دیا ہمیں کہ یہ حوادث آتے رہیں گے ان سے بچنے کی تدبیر یہ ہوگی۔ ان لوگوں کے سامنے حضرتِ نوحؑ کشتی بنا رہے تھے وہ مذاق اڑا رہے تھے اس چیز کا' یہ تھی ان کی سرکشی یہ تھی ان کی معصیت۔ اگر وہ اپنی جذبات کی تاریکیوں میں نہ ہوتے ضد نہ کرتے کہ جو کچھ یہ کرے گا ہم نے اس کے خلاف کرنا ہے۔ دیکھ رہے تھے سامنے کہ یہ کچھ کر رہا ہے بتا بھی وہ رہے تھے کہ یہ اس لیے کر رہا ہوں۔ اگر وہ بھی کشتیاں بنا لیتے وہ بھی بچ جاتے۔ یہ جو گناہ ہے جس کی پاداش میں وہ ڈوبے یا ہم ڈوبے اور ڈوبنے والے ڈوبتے ہیں اور وہ نیکی جس سے بچنے والے بچ سکتے ہیں۔ جہاں تک فطرت کے حوادث کا تعلق ہے میں وہاں تک گفتگو کر رہا ہوں۔

گناہ اور نیکی کے الفاظ جرم اور جرم سے بچنے کے لیے تدابیر کا مفہوم پیش کرتے ہیں

وہ یہی ہے کہ جو قوم صحیح تدابیر نہیں کرتی ان پہ تباہی آجاتی ہے' جو ان کے لیے تدبیریں کر لیتی ہے وہ تباہیوں سے بچ جاتی ہے۔ جسے گناہ کہا جاتا ہے گناہ کا لفظ نہ استعمال کیجیے کہ ہمارے ذہنوں میں اس سے خاص قسم کا تصور آتا ہے' نیکی کے متعلق بھی ہمارا تصور محدود ہو گیا ہے۔ کہیے کہ یہ تباہی آتی ہے قوم کے اس ''اجتماعی جرم'' کے بدلے میں کہ اس نے اس سے بچنے کی تدبیریں اختیار نہیں کی تھیں۔ جرائم کہیے عزیزانِ من! گناہ نہ کہیے۔ کہ یہ سارے بچنے والے معتبر ایک طرف ہو کے بیٹھ جاتے ہیں اور ان مرنے والوں کے کان میں آخری وقت میں یہ ڈال دیتے ہیں کہ تم گناہگار تھے تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں یہ کچھ ملا۔ آواز یہ بلند ہونی چاہیے کہ جو ذمہ دار افراد تھے ان کے مجرمانہ تغافل کی بناء پر یہ سب کچھ ہوا' جرائم کی وجہ سے یہ ہوا اور جرائم یہ ہیں۔ غالباً 1955ء میں یہاں عالمگیر سیلاب آئے تھے۔ میں یہاں سے دور تھا اس زمانے میں کراچی میں تھا' اتنا قریب ہو کے نہیں دیکھا تھا۔ 55 کے بعد یہ 18 سال کا عرصہ ہو گیا۔ مجھے پہلے علم نہیں تھا معلوم ہوا ہے کہ اس زمانے میں Flood Control Commission مقرر کیا ہوا تھا اور وہ آج تک مقرر ہے۔ 18 سال کا عرصہ کچھ کم عرصہ نہیں ہوتا۔

سیلاب کے خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے قابلِ عمل تجاویز

یہ اس طرح بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ ہمارے ہاں سیلاب کیوں آتے ہیں اور اکثر آتے رہتے ہیں۔ ان کی شدت میں کمی بیشی ہوتی ہے سیلاب تو اکثر آتے رہتے ہیں۔ دریاؤں کے راستے میں جو بھی ملک ہوگا وہاں امکان ہے اس چیز کا کہ سیلاب آجائیں۔ ان کے آنے کی وجوہات ہوتی ہیں' طبعی وجوہات (Physical Causes) 'انہیں معلوم کیا جائے۔ اس کے بعد ایک Plan بنایا جائے لمبے عرصے تک کے لیے کہ تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا۔ اس بارش پہ قابو اگر ہمارا

نہیں ہے جہاں یہ برستی ہے وہ بارش جو تباہیاں لاتی ہے ان تباہیوں کے لیے تو حفظِ ماتقدم کے طور پر تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔ اس پندرہ سال کے عرصے میں اگر ہم پچھلے Flood سے ان طوفانوں سے ایک سبق حاصل کرتے اور اس دوران میں اس کے لیے یہ تدابیر اختیار کی جاتیں تو یہ تباہیاں کبھی نہ آتیں۔ سیلاب آتا تباہیاں نہ آتیں۔ جس نسبت سے ہماری تدبیریں ہوتیں اس نسبت سے تباہیاں کم ہوتیں۔ یہ مجرمانہ تغافل تھا جس کی وجہ سے یہ عالمگیر تباہی ہوگئی ہمارے ہاں۔ میں نے کہا تھا ناکہ یہ الفاظ خاص طور پہ استعمال کیے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں کی مذہبی فکر نے ارضی، سماوی تباہیوں سے بچنے کے طریق کی طرف آنے ہی نہیں دیا

یہ ساری چیزیں ہمارے دورِ ملوکیت کے اندر وضع ہوئیں یہ سازش تھی۔ جب بھی اس قسم کا کوئی ارضی یا سماوی حادثہ پیدا ہوا۔ یہ راجہ اور برہمن کی ملی بھگت' بادشاہ اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ۔ انہوں نے مساجد میں خانقاہوں میں میدانوں میں شروع کر دیا چلانا' قوم کو رعایا کو اس زمانے میں یہ کہنا کہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے یہ ہوتا ہے۔ تاکہ کسی کی توجہ ادھر اٹھنے نہ پائے کہ یہ جو ذمہ دار بیٹھے ہوئے ہیں اوپر یہ ان کے جرائم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ تم توبہ کرو تم استغفار کرو تم نفل پڑھو تم خدا کے حضور گڑگڑاؤ۔ لگا دو انہیں اس طرف تاکہ ان میں سے کوئی اٹھ کے اس سے نہ پوچھے جو تخت کے اوپر بیٹھا ہوا ذمہ دار ہے کہ تم نے جو اس خطۂ زمین کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اس کے لیے کیا کیا تم نے' تم مجرم ہو تم ملزم ہو توبہ تمہیں کرنی ہوگی۔ اور توبہ کے معنی یہ ہیں کہ پہلی دفعہ اگر ہوا ہے تو اس کے بعد یہ توبہ کرو کہ دوبارہ نہیں ہوگا دوبارہ اگر ہوگا تو بخشے نہیں جاؤ گے۔

اصل مرض تو مذہبی پیشوائیت کی پھیلائی ہوئی گمراہی اور ابلیسی ملوکیت کی فریب کاریاں ہیں

دیکھتے ہیں عزیزانِ من! ان الفاظ کے معنی اب کیا ہوگئے۔ کہنے کی بات یہ تھی۔ انہوں نے توجہ ہی ادھر نہیں مڑنے دی۔ ہماری ساری تاریخ میں یہ ہوتا آیا ہے کہ جو جن تباہیوں کے ذمہ دار تھے توجہ اس طرف نہیں اٹھنے دی۔ بھوکے مر رہے ہیں صاحب دنیا مر رہی ہے بھوکی' وعظ پر وعظ ہو رہے ہیں کہ کوئی نہیں رزق تو اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ بھوکے مر رہے ہو اُس سے جا کے پوچھو' اِس سے نہ پوچھو جو ذمہ دار بن کے بیٹھا ہوا ہے جس کی بدنظمی کی وجہ سے یہ بھوک اور پیاس آ رہی ہے۔ بیماریاں پھیل رہی ہیں صاحب' خدا کی طرف سے یہ تازیانۂ عبرت برسائے جا رہے ہیں کوڑے' غضب ہے خدا کا' عذاب ہے اس کا۔ یہ ذمہ دار نہیں ہے جو اقتدار کی کنجیاں ہاتھ میں لیے تخت پر بیٹھا ہے۔ نگاہوں کا رخ اُدھر آنے نہیں دیتے۔ یہ ہوتی ہے ابلیسی ملوکیت' یہ ہوتی ہے اس کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کی سازش کہ اصل Cause اور سبب کی طرف نگاہ نہ اٹھنے دے۔ بھوک ہو افلاس ہو' رزق خدا کے ہاتھ میں ہے ہر مصیبت اس کی طرف سے آتی ہے ہر عذاب اس کی طرف سے آتا ہے اِن کی وجہ سے نہیں آتا۔ وجہ تمہارے گناہ ہوتے ہیں۔ تدبیر: گڑگڑاؤ' روؤ تم توبہ کرو' اِسے جو کچھ کرتا ہے کرنے دو۔ یہ ہے عزیزانِ من! وہ چیز کہ جس سے یوں کہیے کہ ہم تو اتفاق سے بچ گئے یا جو ان میں سے اپنی تدبیر سے بچتے ہیں یعنی انہوں نے تدبیریں یہ کی ہوتی ہیں کہ ایسے حوادث آئیں بھی تو ہم بچ جائیں۔

فکرِ قرآنی تو انسانوں کی سوچ میں ایک انقلاب پیدا کر دیتی ہے

ایک تو ہم اس تباہی سے بچ جاتے ہیں پھر اپنے ذہن میں غیر شعوری طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم گناہگار نہیں ہیں۔ یہ خدا کا عذاب تو گنہگاروں پہ آتا ہے لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے آتا ہے یہ مرنے والے جو ہیں یہ سارے کے سارے یہ گناہگار ہیں فاسق ہیں فاجر ہیں گناہگار ہیں۔قرآنِ کریم' عزیزانِ من! نگاہوں کا زاویہ بدل دیتا ہے وہ ہر حادثے اور ہر واقعہ کے سبب کی طرف پہلے رخ کو موڑتا ہے۔ یہ پتہ لو کہ یہ کیوں ہوا ہے۔خدا بار بار کہتا ہے کہ ہم اپنے بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتے' یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتیں ہوتی ہیں۔تو پہلی چیز یہ ذہن کے اندر قرآن راسخ کر دیتا ہے کہ جب بھی کوئی مصیبت آئے تو یہ دیکھو کہ وہ ہاتھ کونسے ہیں جن کی لائی ہوئی یہ مصیبت ہے۔اس فریب میں مبتلا نہ ہو جاؤ کہ یہ ہمارے ہاتھوں کی لائی ہوئی نہیں ہے اُس کی طرف سے یہ کسی طرح آتی ہے۔

ہر ہونے والا واقعہ قوانین خداوندی کی عکاسی کر رہا ہوتا ہے

اس کی طرف سے آنے کے معنی ہوتے ہیں اس کے قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتا ہے۔قوانین کہیے۔قانون اس کا یہ ہے کہ اگر سیلاب کے راستے میں پانی کے راستے میں مکان بناؤ گے اور حفاظتی تدبیر نہ کرو گے تو پانی تمہارے مکان کو بہا کر لے جائے گا۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ یہ مکان والا اگر اس پانی کی رہگذر میں مکان بناتا ہے حفاظتی تدبیر نہیں کرتا' پانی آتا ہے بہا کے لے جاتا ہے۔تو جب یہ کہا جائے گا کہ خدا کی طرف سے یہ ہوا' کہو کہ خدا کے قانون کی خلاف ورزی کا یہ نتیجہ ہوا۔اور قانون یہ تھا کہ سیلاب کی رہگذر میں یا تو بستی بساؤ نہیں' بساؤ تو اس کی حفاظت کا ایسا انتظام کریں کہ پانی کی موجیں آئیں سر ٹکرا کے دوسری طرف چلی جائیں۔انسان کو تو بلا بنایا ہے اس نے' ساری کائنات وہ کہتا ہے کہ تابع تسخیر ہے تمہارے ہاں۔ یہ جو چیز تھی کہ کائنات کی قوتوں کو جو قوم مسخر نہیں کرتی وہ خدا کی معصیت کرتی ہے وہ گناہگار رہے۔

قوانینِ فطرت ہوں یا انسانی زندگی انہیں دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا

ہم نے خدا کے ان قوانین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ جو قوانینِ فطرت ہیں ان کے متعلق تو سمجھا یہ ہے کہ یہ کسی اور کے بنائے ہوئے ہیں۔قوانینِ فطرت کا اتباع کرنے والی قومیں ملحد ہیں بے دین ہیں دہریے ہیں یہ ہیں وہ ہیں ایک دم Condemn۔دوسرا حصہ ہے وہ خدا کے قوانین کا جنہیں ہم اپنے ہاں نیکی اور بدی کا معیار قرار دیتے ہیں۔عزیزانِ من! یہ دونوں قوانین خدا کے ہیں ان دونوں قوانین کی صداقت پر ایمان لانا ایمان دار مومن بناتا ہے۔ان دونوں کا اتباع کرنا عملِ صالح ہے۔ان دونوں کی معصیت کرنا خدا کی معصیت ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ ان دونوں کے اندر جب ان کو الگ الگ آپ رکھ دیتے ہیں یہ شرک ہو جاتا ہے۔وہ قومیں کہ جنہیں دہریہ ملحد بے دین کہتے ہیں وہ یہ جو حصہ ہے خدا کے قوانین کا وہ ان کی صداقت پر تو ایمان رکھتے ہیں ان کی معصیت نہیں کرتے ان کی اطاعت تو کرتے ہیں۔لیکن وہ جو دوسرا حصہ ہے خدا کے قوانین کا جس کا تعلق عالمِ انسانیت سے ہے اس کا انکار کرتے ہیں اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔نتیجہ یہ کہ وہ خود تو محفوظ رہ

جاتے ہیں ان کے ہاتھوں سے باقی انسانیت محفوظ نہیں رہتی۔ اور مومن وہ ہے کہ جو ان دونوں قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے ان کے مطابق اپنا نظام قائم کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان قوانینِ فطرت کی اطاعت سے تدابیر ایسی محکم کر لیتا ہے کہ خود ان سے محفوظ رہتا ہے اور وہ جو اقدارِ سماوی کہلاتی ہیں انسانیت کے متعلق قوانین جنہیں میں نے کہا ہے ان کی اطاعت سے باقی انسانیت بھی ان کے ہاتھوں محفوظ رہتی ہے۔

خدا تعالیٰ کی صفات میں ایک صفت المومن یعنی امن دینے والا کی ہے

مومن کہتے ہیں جو امن دینے والا ہو۔ یہ معنی ہی کبھی ہمارے سامنے نہیں آئے۔ وہ جو خدا نے اپنے آپ کو المومن کہا ہے تو اگر مومن کے معنی ایمان لانے والا ہی صرف ہو تو یہ خدا کس چیز پہ ایمان لاتا ہے جو اپنے آپ کو المومن کہا ہے۔ تو المومن اس نے کہا ہے کہ وہ امن دینے والا ہے کائنات کو۔ اسی طرح اس کے بندے جو مومن کہلاتے ہیں وہ ٹھیک ہے کہ اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لانے والے آپ کہہ لیجیے۔ نتیجے کے اعتبار سے خدا کی صفت جو ہے المومن ہونے کی یہ عالمِ انسانیت میں اس صفت کے عملاً ظہور میں لانے کے موجب بنتے ہیں امن کے ذمہ دار ہوتے ہیں علمبر دار ہوتے ہیں انسانیت کے امن کے۔ تو انسانیت کو امن تو وہی دے سکیں گے جو خود امن میں ہوں۔ جو خود بھوکی قوم ہو وہ دوسروں کو کیا کھلائے گی۔ جسے پانی جیسی چیز کہ جس پہ مدار ہے زندگی کا وہ ان کی موت کا باعث بن جائے وہ دوسری قوموں کو کیا حیات بخش چیزیں دے گی۔

کائناتی قوتوں کے ماحصل کو اقدارِ سماوی کے تابع صَرف کرنے والے کو قرآن مومن کہتا ہے

یہ ہے چیز عزیزانِ من! جس طرف توجہ کا رخ جانا چاہیے۔ یہ ہیں خدا کے قوانین جن کی معصیت ہم نے کی۔ تو ایک قوم تو وہ ہوگئی کہ جو فطرت کے قوانین کو بھی مسخر کرتی ہے اور انہیں پھر جیسا میں کہا کرتا ہوں اقدارِ سماوی کے تابع ان قوتوں کو صرف کرتی ہے۔ خود بھی امن میں رہتی ہے دنیا کو بھی امن میں رکھتی ہے۔ یہ ہیں جنہیں مؤمنین کی جماعت کہا جاتا ہے جو قرآن تیار کرتا ہے۔

قوموں کی دوسری اور تیسری کیٹگری کی کیفیت اور ان کے کردار کی پسماندگی

ان سے نیچے وہ قومیں ہیں جو فطرت کے قوانین پر ایمان رکھتی ہیں ان کے مطابق اطاعت کرتی ہیں۔ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہیں دوسرا حصہ چونکہ اس پہ ایمان نہیں ہوتا ان کا' انسانیت ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہتی لیکن خود تو کم از کم محفوظ ہوتے ہیں' فطرت کی قوتوں سے خود تو بہرہ یاب ہو جاتے ہیں۔ اور ایک تیسری قوم ہے کہ جو ان دونوں قوانین میں سے کسی پہ بھی ایمان نہیں رکھتی نہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے۔ اور جو فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی وہ اقدارِ سماوی کے ماتحت ان کا استعمال کیا کرے گی وہ تو مسخر ہی نہیں کرتی۔ جسے کہا جائے گا کہ اپنے خرچ میں اعتدال رکھو' اسے کہا جائے گا نا جس کے پاس کچھ ہو۔ جس کے پاس ہی کچھ نہیں ہے اس کو یہ حکم کیا کہ صاحب اس میں اسراف نہ کرو اپنے خرچے میں' وہ کہے گا میرے پاس تو پیسہ ہی ہے نہیں۔ جو قوم فطرت کی قوتوں کو بھی مسخر نہیں کرتی اقدارِ سماوی کے ساتھ اس کا تعلق ہی کچھ نہیں

ہوتا۔(خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَۃَ) یہ ہے وہ مقام عزیزانِ من! جہاں ہم کھڑے ہوئے ہیں۔الفاظ باقی رہ گئے ہمارے پاس' وہ بھی اب دھوکا دینے کے کام آتے ہیں ان بیچاروں کو جن کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جب ہماری قوم کی مجرمانہ تغافل ایک بلا لاتی ہے ایک سیلاب لاتی ہے انہیں کھڑے ہو کے ہم کہتے ہیں کہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے یہ کچھ آیا' ہم بڑے نیکو کار ہیں۔ عزیزانِ من! قوم پوری کی پوری گناہگار ہوتی ہے۔ یہ جرائم قومی کہلاتے ہیں اجتماعی کہلاتے ہیں ملی کہلاتے ہیں۔اور یہی ہیں جن کی وجہ سے قرآن نے یہ کہا تھا کہ بچو اس فتنے سے کہ جب وہ آیا کرتا ہے تو (خاصۃ للظلمین) نہیں رہا کرتا پھر' ساری قوم اس کے اندر مبتلا ہوتی ہے۔ یہ کبھی کسی نے کہا تھا کہ سیلاب نہ پرسد کہ درِخانہ کدہ مست''؟؟ اسے پچھداہیگا کہ جی گھر دا دروازہ تہاڈا کدھر ہے میں کدھروں دی آواں جی ذرا دسنا' اندروں کنڈی تے کھولو' وہ نہیں پوچھتا یہ۔اور جب وہ نہیں پوچھتا عزیزانِ من! تو وہ سیل بلا آتا ہے تو وہ مندر اور مسجد میں بھی تمیز نہیں کرتا دونوں کو بہا کے الگ چلا جاتا ہے۔ بلکہ اگر مندر کی عمارت زیادہ مستحکم ہے تو وہ بچ جاتی ہے مسجد کے بھی مقابلے میں۔فطرت کے حوادث کے سامنے یہ چیز کوئی شے نہیں ہے۔مسجد تو ایک طرف رہا کعبہ بھی جلا وہ بھی سیلاب کی زد میں آیا جب حفاظتی تدابیر نہیں کی گئیں تھیں' ہم کس بلا کی مٹی ہیں۔

قرآن حکیم پر ایمان رکھنے والوں کا فریضہ تو پوری انسانیت کو تحفظ فراہم کرنا ہے

عزیزانِ من! یہ حوادث فطرت کے کائنات کے جو قوانین ہیں ان کی رو سے آتے ہیں۔ان کے متعلق علم حاصل کرنا قرآن ماننے والوں کا اولیں فریضہ ہے۔ پھر علم حاصل کرنے کے بعد ان کی روک تھام کا انتظام کرنا حفاظتی تدابیر کرنا اعمالِ صالح کا پہلا حصہ ہے۔اور پھر اس کے بعد اتنا صاحبِ قوت اور صاحبِ تدابیر ہونا کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی اس قسم کی کوئی مصیبت آئے وہاں جا کے اپنے سینہ سپر ہو کے کھڑے ہو کے ان کو بھی روکنا۔ میں نے کہا ہے نا کہ یہ سیلاب تو نہیں فرق کرتا مسجد اور مندر میں۔مومن کے متعلق کہا گیا کہ سیلاب ان کو تباہ کرنے میں فرق نہیں کرتا' تم ان کو محفوظ رکھنے میں فرق نہ کرنا۔ یاد نہیں قرآن کی وہ آیت جس میں اس نے کہا ہے سورۃ حج میں کہ اگر ہم اس قسم کی جماعت تیار نہ کریں جسے جماعتِ مؤمنین کہا جاتا ہے نہ یہودیوں کے سومے بچیں نہ عیسائیوں کے گرجے بچیں نہ ہندوؤں کے مندر بچیں نہ تمہاری مسجدیں بچیں۔ یہ ہے وہ قوم۔ پھر قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ پہلے دوسرے مذاہب کے عبادت کدوں کو لیا آخر میں مسلمانوں کی اپنی مسجد کا ذکر کیا۔ اور جو قوم اپنے گھر کو بھی نہیں بچا سکتی وہ دوسروں کی عبادت گاہوں کو کیا بچائے گی۔پہلی چیز تو عزیزانِ من! یہ ہے ان حوادث کے متعلق یہ تدابیر اختیار کرنا یہ بھی اطاعت ہے قوانینِ خداوندی کی۔اور اگلی بات یہ ہے کہ جب یہ حادثہ آجائے تو پھر اس سے نمٹا کس طرح سے جائے۔ یہاں آتے ہیں وہ دوسرے اقدارِ خداوندی جسے میں نے کہا ہے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں شدید قحط اور پھر طاعون پھوٹنے کے واقعات سے چھٹکارا حاصل کرنے کا علاج

ہمارے صدرِ اول کی تاریخ میں بھی یہ حادثہ آیا بلکہ بیک وقت دو سماوی آفات تھیں۔حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں قحط بڑا شدید پڑا طاعون بڑی شدت سے ہوا۔ طاعون کے متعلق تو ساری بات حضرتِ عمرؓ کے ایک فقرے میں سمٹ کے آ گئی۔ وہ

فقرہ کہ جس کی مثال میں یونان کے Plato سے لے کے آج تک کے برگسان کے ہاں کہیں نہیں پاتا۔علیٰ وجہ البصیرت یہ بات دعوے سے کہہ رہا ہوں۔ جب آپ وہاں پہنچے ہیں شام کے قریب وہ طوفان پھوٹا تھا۔ وہاں کہا گیا آپؓ سے کہ آگے نہ جایئے' آپؓ نے بیٹھ کے مشورہ کیا وہ آگے علاقہ آتا ہے جہاں طاعون ہے وہاں جانا چاہیے یا واپس چلے جانا چاہیے۔ فیصلہ آپؓ نے یہ کیا کہ نہیں واپس چلے جانا چاہیے اُس علاقے میں جہاں طاعون نہیں ہے۔ اعتراض کرنے والوں نے اعتراض یہ کیا انہوں نے کہا کہ عمرؓ خدا کی تقدیر سے بھاگ رہے ہو۔ بظاہر وزنی اعتراض نظر آتا ہے۔ سنتے ہیں آپ جواب کیا ملا۔ کہا ابوعبیدہؓ سن لو' میں خدا کی ایک تقدیر سے خدا ہی کی دوسری تقدیر کی طرف جا رہا ہوں۔ زاں کہ تقدیرات حق لاانتہا۔ اس کی ایک تقدیر یہ ہے کہ جہاں یہ وبا پھوٹ رہی ہو وہاں چلے جاؤ گے تو متعدی مرض ہے تمہیں بھی لگ جائے گا۔ اس کا دوسرا قانون یہ ہے کہ جہاں یہ نہیں ہے اگر وہاں رہو گے تو اس سے بچ جاؤ گے۔ کہا یہ دوسرا قانون بھی تو میرا نہیں بنایا ہوا یہ بھی تو اسی خدا ہی کا ہے جس کا وہ قانون ہے کہ اگر جاؤ گے متعدی امراض میں تو اس میں گرفتار ہو جاؤ گے' اس سے صاف علاقے میں نکل جاؤ گے تو بچ جاؤ گے۔ دونوں قوانینِ خداوندی ہیں۔

قوانین خداوندی کو اپنانے کے سلسلہ میں انسان کے اپنے فہم اور تدبر کا عمل دخل

سوال صرف یہ ہے انسان کے تدبر کا کہ وہ یہ دیکھے کہ بیک وقت جب دو ممکنات اس کے سامنے آئیں Two Possibilites ان کے سامنے آئیں ان میں سے کونسی اختیار کرنی چاہیے۔ کہنے لگا اس وقت مومن وہ اختیار کرتا ہے جس میں امن میں رہتا ہے وہ۔ اور جب قحط آیا ہے تو آپ سوچئے عرب جیسا اور یہ وادیٔ غیر ذی زرع مکہ اور مدینہ کا علاقہ جہاں کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ لیکن بہرحال مدینہ کیپٹل تھا وہاں Provision رکھی جاتی تھی۔ قحط پڑا ہے تو اردگرد کی باہر کی ساری آبادیاں صحراؤں کے جتنے لوگ رہنے والے تھے کوئی متبادل صورت ہی اس کے سوا نہیں تھی کہ وہاں سے اٹھ کے آجاتے اور مدینے آجاتے۔ اور وہ جوق در جوق آگئے۔ ٹھیک ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ فوراً ہی ان کے لیے باہر رہنے کا انتظام کر دیا گیا خیمے لگا دیے گئے ٹھیک ہے آتے جایئے۔

فکرِ قرآنی نے حضرت عمر فاروقؓ کو نظرِ شاہین عطا کر دی تھی

یہاں سے پھر وہ نگاہِ فاروقیؓ سامنے آتی ہے۔ آتے ہی فوراً تو یہ چیز ہوئی کہ یہ جو آئے مدینے سے پکا ہوا کھانا یہاں بھیجا گیا اُنہوں نے کھایا۔ لیکن نگاہِ فاروقیؓ نے یہ بھانپ لیا کہ وہاں سے پکا ہوا کھانا جب ان کے پاس آتا ہے تو ان میں احساس ایسا پیدا ہوتا ہے کہ ہم ان لوگوں کے دست نگر ہیں خیرات کا کھانا کھاتے ہیں' امت کے دل میں یہ خیال نہیں پیدا ہونا چاہیے۔ کیا کیا؟ سارے مدینے والوں سے یہ کہہ دیا کہ تمہارے گھر میں سارے شہر میں کوئی چولہا نہیں جلے گا۔ سب باہر آؤ ان کے ہاں' ایک دسترخوان ہوگا' جو کچھ اندر ہے سب لے آؤ' ایک جگہ پکے گا ایک جگہ کھائیں گے۔ اللہ اکبر۔ اور انہی میں عمرؓ خود بیٹھا ہوا تھا۔ جو ملتا تھا مساوی سب کھاتے تھے۔

پیٹ کی گڑ گڑاہٹ عمر کو دھوکا نہیں دے سکتی

مساواتِ محمدی ﷺ کا نام آجاتا ہے۔محمدی ﷺ تو بہت بلند مساوات ہے مساواتِ عمرؓ ہی کو تو دیکھو وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔بعض چیزوں کے نہ کھانے کی عمر بھر ایک کیفیت ہوتی ہے انسان کی طبیعت پہ ان کا اثر ہوجاتا ہے۔آپ تیل نہیں کھایا کرتے تھے' صحت کے حساب سے صرف' لذت اور عیاشی کا تو سوال ہی نہیں ہے۔اتنی بڑی آبادی کے لیے میسر ہی تیل آرہا تھا ان کے اندر خود بیٹھے ہوئے وہی تیل کھایا کرتے تھے۔ابنِ عمرؓ بیٹا کہہ رہا ہے کہ چہرہ جھلس گیا ہے آپ کی رنگت سیاہ پڑ گئی ہے جھریاں پڑ گئیں' پیٹ میں ہر وقت درد رہنے لگا۔تو کہتے ہیں کہ جب یہ زیادہ گڑگڑاتا تھا درد سے تو آپؓ اسے کہا کرتے تھے کہ تیری گڑ گڑاہٹ سے میں دھوکے میں نہیں آسکتا کہ باقی امت تو تیل کھائے اور تیری وجہ سے عمرؓ گھی کھانے لگ جائے' عمرؓ فریب میں نہیں آسکتا' اپنے پیٹ کے فریب میں بھی نہیں آسکتا۔

حضرت عمرؓ فاروق کو اپنے دورِ خلافت کی ذمہ داریوں کے احساس کی ایک اور جھلک

آپ کی دن بھر کیفیت یہ تھی کہ ان کیمپوں کے اندر پھر رہے تھے ایک ایک کی ضرورت کے مطابق وہاں پہنچاتے تھے۔ایک وہ علاقہ تھا جہاں کے معذور' بچے وغیرہ آنہیں سکتے تھے وہاں کی ذمہ داری خود آپؓ لے لی تھی آپ نے فرمایا کہ ان کی نگرانی میں کرونگا۔دن بھر یہ ہوتا تھا اور جسے رات بھر اب ہم کہتے ہیں دعاؤں میں گذارتے تھے رات بھر پلاننگ اسکے لیے ہوتی تھی مجلسِ مشاورت بیٹھتی تھی۔رات سوتے نہیں تھے دن یہ کچھ کرتے تھے۔تو یہ چیز ہمارے ہاں تاریخ میں ہے ساتھیوں کی یہ بات کہ ہمیں فکر تھی کہ اگر یہ قحط کچھ عرصہ اور رہا تو قحط سے یہ قحط زدگان تو بچ جائیں گے عمرؓ زندہ نہیں بچے گا۔عزیزانِ من! حادثہ آتا ہے اُسے نپٹا یا اس طرح سے جاتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس قحط میں ایک فرد بھی ہلاک نہیں ہوا تھا۔جو ملتا تھا اسے یوں برابر بانٹا جاتا تھا۔اسی قحط ہی کا واقعہ ہے نا کہ ایک دن اپنے پوتے کو دیکھا کہ وہ کوئی فروٹ پھل کی قسم کی چیز کھا رہا تھا۔ایک دم بیٹے کو بلایا کہ یہ کیا ہے لوگ بھوک سے مر رہے ہیں اور عمرؓ کا پوتا فروٹ کھا رہا ہے۔اُنہوںؓ نے کہا سرکار عمرؓ کا پوتا بھی وہی کچھ کھاتا ہے جو دوسروں کو ملتا ہے' صبح ناشتے میں جو کھجوروں کی گٹھلیاں بچوں کو ملیں کسی کاشتکار کا بچہ کوئی تھا اس کے پاس ککڑی تھی عمرؓ کے پوتے نے اپنے حصے کی کھجوروں کے ستو اس کو دیدیے اور اس نے وہ ککڑی اس نے اس کو دیدی یہ وہ ککڑی کھا رہا تھا فروٹ نہیں کھا رہا تھا۔حادثہ آتا ہے تو پھر نپٹا یوں جاتا ہے۔

مِرا مرنا خلوصِ نوحہ گر کی آزمائش ہے

یہ حادثہ درحقیقت ان کا حادثہ نہیں ہوتا جن کے اوپر براہِ راست بلا گرتی ہے یہ حادثہ ان کے لیے ہوتا ہے جو ابھی محفوظ ہوتے ہیں۔وہ جو میں نے ایک دن بے ساختہ اس مرحوم دوست کا مصرع سنایا تھا آج بار بار یاد آتا ہے کہ میرا مرنا خلوصِ نوحہ گر کی آزمائش ہے۔پتہ نہیں کس عالم میں یہ کہہ گیا تھا۔یہ جو مرنے والے ہوتے ہیں حوادث میں عزیزانِ من! ان کا مرنا ہم جینے والوں کے خلوص کی آزمائش ہوتا ہے۔گناہگار وہ نہیں تھے جو اس سیلاب کے اندر مر گئے۔پہلے گناہگار وہ تھے کہ جنہوں

نے حفاظتی تدبیریں ان کے لیے نہ کیں اور اس کے بعد گناہگار ہم ہیں جو حادثے کے شکار ہوئے اور ان کے لیے کچھ نہیں کر رہے یا جتنا کرنا چاہیے وہ نہیں کر رہے۔ یہاں اگر عمرؓ کے پوتے میں اور بدو کے لڑکے میں تمیز ہو جائے گی یہ ہوگا وہ گناہ جو بخشا نہیں جائے گا جسے کوئی توبہ بخش نہیں سکے گی۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک سب سے بڑا جرم انسان کی ہلاکت ہے

عزیزانِ من! انسانوں کے گناہ تو انسان بخشا کرتے ہیں۔ خدا نہیں بخشا کرتا۔ اور انسانوں کے گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ قرآن نے یہ گنایا ہے کہ یاد رکھو جس شخص کے ہاتھوں کوئی ایک متنفس بھی ضائع ہو گیا ناحق' جرم کے اعتبار سے سمجھ لو کہ اس نے پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا۔ ایک فرد بھی عزیزانِ من! جو بچ سکتا ہے ہمارے کچھ کرنے سے' اگر وہ ہلاک ہو گیا ہے ہمارے اس نہ کرنے سے' خدا کی میزان میں یہ جرم ہے کہ ہم نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔ سوچ سکتے ہیں اس کی سزا کیا ہوگی۔ یہ ہے وہ غضب جسے ہم کہتے ہیں خدا کا آیا کرتا ہے یہ ہیں وہ جرائم جن کی وجہ سے یہ سزائیں ملتی ہیں۔ نگاہ کا رخ اس طرف رکھو عزیزانِ من! پھر بات بھی سمجھ میں آ جائے گی اور پھر آئندہ کے لیے ہم ان تباہیوں سے بھی بچ جائیں گے۔ ورنہ اگر ہم یہی پکارتے رہے کہ یہ مرنے والے اپنے گناہوں کی پاداش میں مر گئے' جینے والے ہم اس لیے جئے کہ ہم بڑے مقربین بارگاہِ الٰہی تھے۔ آئندہ ہم اسی طرح ان کی زد میں آ جائیں گے۔ سوال اس وقت یہ ہے کہ آج ہم بچنے والوں کے خلوص کی جو آزمائش ہو رہی ہے اس میں ہم کس حد تک پورے اتر رہے ہیں۔ ہمارے مجرمانہ تغافل کی وجہ سے جو بیچارے مر گئے ہیں جو تباہ ہو گئے ہیں ٹھیک ہے ان کی اس تباہی کی سزا بھی ہمیں ملے گی۔ قومی حیثیت سے ساری قوم کو میں کہتا ہوں اس میں ہم شامل ہیں۔ لیکن جو بچ گئے ہیں ان کے لیے جو کچھ کرنا چاہیے اگر ہم کہ جو اس سیلاب سے اس تباہی سے بچ گئے ہیں اگر ہم سے کوتاہی ہوگی تو یہ اگلا جرم ہوگا جس جرم کی سزا ہمیں الگ ملے گی۔ حفاظتی تدابیر کی طرف سے تغافل برتنے میں پوری قوم کی قوم کو وہ سزا اور ان کے لیے جو کچھ کر سکنا ہے اسے نہ کر سکنے کی ہمیں سزا جو ہم زندہ ہیں۔ اور

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

یہ فطرت کی تعزیریں ہیں نا جو ہم پہ آ رہی ہیں۔

سیلاب سے بچنے والوں کی آسودہ حالی اور سیلاب میں تباہ ہونے والوں کی الم انگیز داستان

آج ہم میں سے ایک ایک کو یہ سوچنا چاہیے کہ میں جو اطمینان سے محفوظ اپنے گھر میں بال بچوں میں بیٹھا ہوا اسی طرح سے وقت کے اوپر کھا رہا ہوں پی رہا ہوں۔ اس لیے کہ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے اس پانی نے اپنا رخ ادھر موڑ لیا تھا' میری اور کوئی کاریگری نہیں تھی۔ وہ جو اس سے بچنے کے لیے درختوں کی شاخوں پر لٹکے رہے تباہ ہونے والے گھروں کی چھتوں کے اوپر بیٹھے رہے ان گذرگاہوں کے اندر کسی نہ کسی طرح سے بچ گئے۔ وہ جو اس وقت سانس لے رہے ہیں اس دھوپ کے اندر سڑی ہوئی دھوپ کے اندر بغیر کسی قسم کے سایے کے' سڑکوں پر' ریلوں کی پٹڑیوں پر' ٹیلوں پر۔ اور جب

بارش ہوتی ہے تو اس کے بعد بارش سے بچنے کا کوئی سامان نہیں' پیچھے جانے کا کوئی سامان نہیں کہ جو کچھ پیچھے تھا وہ تو سارا ختم ہو گیا۔ آگے کوئی جگہ نہیں ہے کہ ابھی کوئی بستی بسی نہیں کہ جہاں جا کے وہ بس جائیں۔ وہاں پڑے ہوئے ہیں۔ کس جرم کی پاداش میں؟ کہ ہم نے ان کی حفاظت کا قبل از وقت انتظام نہیں کیا تھا۔ آج ہم بچے ہوئے ہیں تو اپنی کسی کاریگری کی وجہ سے نہیں بچے ہوئے ہیں۔ غنیمت سمجھنا چاہیے عزیزانِ من! کہ ہم کسی طرح سے اس سے بچ گئے ہیں۔ کم از کم اس بچنے کا صدقہ ہی اتنا دو کہ ایک فرد ایک کو تو بچا لے کسی طرح سے۔ اس سیلاب کی تباہی میں اتنے نہیں تباہ ہوئے جو اس کے بعد ان بچنے والوں میں تباہ ہونگے بھوک سے پیاس سے موسم کی شدت سے بیماریوں سے دوائیاں نہ ملنے سے کھانے کے لیے نہ ملنے سے کسی شیلٹر کے نہ ہونے کی وجہ سے۔ اور پھر انسانوں کے ہاتھوں لوٹ کھسوٹ سے۔ افوہ۔

سیلاب نے ان کی جان لی اور ان کی غیرت اور عزتِ نفس کو لوگوں نے پامال کیا

پانی کے ہاتھوں لٹنے کا تو اتنا صدمہ نہیں ہوتا عزیزانِ من! جتنا صدمہ اس میں ہوتا ہے کہ ایک دوست شاہدرہ کی بستی سے جان بچا کے اپنے بچوں کو ننھے بچوں کو لے کے یہاں چلا آیا۔ غریب آدمی تھا' پانی تھما تو اس نے کہا کہ میں جا کے دیکھو کہ اس میں سے کوئی دو چار برتن لے آؤں کہ جس میں کم از کم گلاس ہی ایک مل جائے کہ میں بچوں کو پانی پلا سکوں۔ جب وہ گیا ہے تو پانی اتر چکا تھا اور گھر میں سے سب کچھ لٹ چکا تھا۔ اور یہ قوم جو ہے یہ بچ جائے گی خدا کے عذاب سے جسے آپ کہتے ہیں۔ غریب کے گھر میں تھا کیا' ایک گلاس موجود نہیں تھا کہ جس میں لا کے اپنے بچے کو پانی پلا سکے۔ اور یہ جو بچے ہوئے اول تو خیال ہی نہیں آ رہا تھا خیال آتا ہے تو ان کو جا کے ایسے دیتے ہیں جیسے کسی بھکاری کو گداگر کو خیرات کا ٹکڑا دیتے ہیں۔

تباہ حال گھرانوں کی نوجوان بچیوں کی داستان

عزیزانِ من! خدا کے لیے ان کی جان تو اس عذاب نے لی تھی ان کی غیرت کو تو تم نہ خریدو۔ آج تک اس واقعہ کو نہیں بھول سکتا 1965ء کی جنگ میں جو یہاں سے ہمارے ہاں جنگ کی وجہ سے در بدر ہوئے تھے کچھ لوگ وہ یہاں آ کر ادھر بس گئے ہوئے تھے۔ ان گاؤں کے لوگ شہر میں آ گئے تھے۔ ان کی لڑکیاں جوان لڑکیاں تھی ان میں سے ایسی بھی تھیں جن کی شادی کے دن بھی جسے کہتے ہیں مقرر ہوئی ہوئی تھیں تاریخیں۔ یہاں کے رہنے والوں میں سے کچھ گھرانوں نے یہ کیا تھا کچھ انتظام کیا کہ یہاں اچھا ہے ان کے ہاں کے وہ خاوند یا ان کے سسرال کے لوگ بھی آ گئے ہوئے تھے یہ بھی تھے کہ ان کا نکاح پڑھا دیا جائے بچیوں کی عصمت محفوظ رہ جائے گی۔ یہاں کے رہنے والے ان گھرانے والوں کو اللہ ان کو خوش رکھے اُنہوں نے انتظام اس طرح سے کیا کہ بچیوں کو اس طرح سے وداع کیا جائے کہ جیسے گھروں سے ماں باپ وداع کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے معیار تو وہ نہیں تھا نہ ہو سکتا تھا لیکن ان کو خالی ہاتھوں نہیں جانے دیا تھا۔ ایک سہاگن ایک دلہن کی طرح جیسے وداع کرتے ہیں اتنا کچھ تو کم از کم اسے دیدیا تھا۔ میرے حصے میں اتنی سعادت تھی علاوہ اور چیزوں کے بہر حال جو میں کر رہا تھا کہ ایک نکاح پڑھانے کی چیز تھی وہ بھی میرے ہاں ہوتی تھی۔ ایک بچی کا نکاح پڑھایا اور اسے دینے کے لیے جہیز کی کچھ چیزیں جو تھیں وہ

رکھی گئیں۔ بچیاں میرے لیے میری بیٹیاں تھیں مجھے بھی باباجی اپنا کہتی تھیں۔ ایک بچی نے گھونگھٹ میں سے روتے ہوئے مجھے کہا کہ باباجی مجھے یہ چیزیں نہ دیجیے۔ میں حیران تھا کہ اس بچی نے یہ کیوں کہا۔ کہا یہاں تک ٹھیک ہے جو آپ نے کیا۔ گاؤں کے لوگ وہاں تھے میں نے ان سے پوچھا کہ اس بچی کی خاص بات کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ ہمارے گاؤں کے نمبردار کی بیٹی ہے باپ بھی وہاں شہید ہوگیا بھائی بھی رہ گئے ماں وغیرہ ہیں۔ نمبردار کی بیٹی ہے اس کی شادی انہی دنوں میں ہونے والی تھی نمبردار نے سات گاؤں کے لوگوں کو دعوت دی ہوئی تھی اور اس کے لیے بھینسیں اور گھوڑیاں اور گائے۔ ہمارے ہاں یہ کچھ بھی دیتے ہیں بیٹی کو یہ بھی دے رہا تھا۔ اور پھر ایک نیکی کے بدلے میں گاؤں کی ایک یتیم لڑکی تھی وہ اس کی بھی شادی کررہا تھا اس کے لیے بھی اس نے کچھ جہیز بنایا ہوا تھا۔ ٹھیک ہے بیٹی کے پیمانے کا تو نہیں ہوتا تھوڑا ہوتا ہے۔ وہ جہیز اس یتیم بچی کے دینے کے لیے تھا۔ یہ بچی جس کو ہم وداع کررہے تھے اس کی نگاہ جب ان چیزوں کے اوپر پڑی تو اس نے محسوس کیا کہ یہ اس قسم کی اور ویسے ہی انداز کی خیرات کی چیزیں ہیں جس طرح میرا باپ میری شادی میں ایک یتیم لڑکی کو دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ اس احساس کو برداشت نہیں کرسکی اس نے کہا کہ باباجی مجھے یہ چیزیں نہ دیجیے خدا کے لیے مجھ پہ رحم کیجیے۔ انسانی غیرت اور حمیت تو یہ چیز ہوتی ہے عزیزانِ من! اسے نہ خریدیے اس کا سودا نہ کیجیے۔ دینا ہے کسی نے تو اس طرح سے دو۔

؎ یوں بھیک دے کہ دستِ عطا کو خبر نہ ہو

خیرات کی طرح سے نہ دو۔ عزیزانِ من! ہمارے بھائی بند ہمارے ہی جیسے ہیں۔ ہم سب ایک مشترکہ مصیبت کے اندر گرفتار ہیں' ہمارے پاس کچھ بچ گیا ہے ان کے پاس کچھ نہیں بچا۔ دو بھائیوں میں بانٹ کے کھانے والی جو کیفیت ہے اس انداز سے کچھ کرو۔ یہ کرو تو اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس دنیا میں بھی آپ کو امن مل جائے گا اور اگر ایمان ہے تو اس کے بعد کی زندگی میں بھی اللہ آپ کی حفاظت کرے گا۔

ملکی اور قومی سطح پر کرنے کا کام: ذمےداروں سے پوچھنے والی بات

یہ ہے عزیزانِ من! آج کرنے کا کام اس قوم کے لیے۔ اور اس کے بعد قوم کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ہر وقت نگاہ رکھے اور پوچھتی رہے کہ ذمہ دار ارباب نے کیا کیا کہ آئندہ کے لیے ایسی تباہی اس ملک پہ نہ آئے۔ بجائے اس کے کہ کچھ لوگ اقتدار پر آجائیں جو باقی رہ جائیں ان کی کوشش یہ ہو کہ کسی طرح سے اقتدار ان سے چھن کے ہمارے پاس آجائے۔ مسئلہ ہی سارا یہ رہ جائے۔ بجائے اس کے کہ اس کے اندر یہ سارے کے سارے ذمہ دار ارباب قوم کے ابنائے قوم جنہیں کہتے ہیں وہ اس کے اندر سارے کے سارے آجائیں۔ اس کی بجائے ان سے ہر وقت پوچھئے کم از کم اس سیلاب کے بعد یہ ایک سوال تو پوچھتے رہیے۔ جو بھی تمہارے پاس آئے مخالف میں آئے موافق میں آئے پوچھئے یہ کہ آپ نے کیا تدابیر اختیار کیں کہ آئندہ کے لیے قوم اس ہلاکت کا شکار نہ ہو۔ یہ پوچھئے عزیزانِ من! ہر لیڈر بننے والے سے پوچھئے' ہر نعرہ لگانے والے سے پوچھئے' ہر جلوس نکالنے والے سے پوچھئے اور ہر ووٹ مانگنے والے سے پوچھئے کہ آپ نے اس قوم کی حفاظت کے لیے کیا

تدابیر اختیار کی ہیں۔ اور اس معیار کے مطابق یہ جائزہ لیجیے کہ یہ اس قابل ہے کہ اس کی کوئی بات مانی جائے۔ اگر عزیزانِ من ! عوام کی بات آج کچھ معنی رکھتی ہے کہ جسے ہر وقت کہا جاتا ہے۔ عوام کی بات کے معنی یہ ہونگے کہ اب یہ جینے والے عوام یہ پوچھیں اور ان میں سے ہر ایک سے پوچھیں کہ اس دفعہ ہم تو بچ گئے ہیں۔ آپ نے کیا انتظام کیا ہے کہ آئندہ کے لیے یہ ہلاکت ہمارے سر پہ مسلط نہ ہو جائے۔

خدا تعالیٰ کے نزدیک وعدے کی اہمیت اور قدر و منزلت

یہ صرف کسی کے وعدے پہ نہ رہیے۔ وعدہ تو اس انداز کا ہونا چاہیے میں نے پہلے بھی ایک درس میں یہ چیز کہی تھی۔ وعدہ کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ کریم نے کئی مقامات کے اوپر خدا کا وعدہ بھی یہ کہا ہے ہم نے یہ وعدہ کیا ہوا ہے ہم نے یہ وعدہ کیا ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ اس نے ایک جگہ کہا ہے کہ ہم تو بڑے؟؟ القول واقعہ ہوئے ہیں بات کے سچے (لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ) کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ اس کی تاکید کو زیادہ نمایاں کرنے کے لیے کہا گیا ہے کہ ہمارا وعدہ بھی وہ ہے کہ اگر تم کسی وقت دیکھو نہیں پورا ہوا تو ہم سے بھی پوچھ سکتے ہو کہ کیوں پورا نہیں ہوا۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ (ان وعد ربك كان مسئولا)۔ وعدہ تو وہ چیز ہے عزیزانِ من! یہ سارے وعدے ہیں نا جو ایسے وقتوں میں کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد فریضہ ہو جاتا ہے وعدہ کرنے والا کہ وہ بتائے کہ میں یوں پورا کر رہا ہوں۔ اور فریضہ ہو جاتا ہے اس کا کہ جس کے ساتھ وعدہ کیا جائے کہ وہ اس کے بعد پوچھے کہ یہ وعدہ جو کیا تھا وہ پورا کیوں نہیں ہوا کیوں وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ اور اس چیز کو سب سے پہلا بنیادی جرم قرار دو۔ یہ ہے عزیزانِ من! بچنے کی بات۔ اس معلمِ صادق ﷺ نے جو قوم کو تعلیم دی تھی وہ تو ایک قدم آگے لے گیا تھا قوم کو۔

حضرت عمر فاروقؓ کا طرزِ عمل اور اندازِ خلافت حکومتِ الٰہیہ کا ترجمان تھا

شام کے صحرا میں حضرتِ عمرؓ اپنے معمول کے مطابق بذاتِ خود جا کر ایک ایک کا حال معلوم کیا کرتے تھے۔ اپنے اخبارات پر ہی بھروسہ نہیں کیا کرتے تھے خود جا کر معلوم کیا کرتے تھے کہ حال کیا ہے۔ ایک بوسیدہ سے خیمے میں گئے وہاں ایک بڑھیا تنہا بیٹھی تھی۔ اس سے پوچھا (آپ کی زبان میں کہونگا) کہ مائی کیا حال ہے تمہارا۔ اس نے کہا کہ تمہیں میں حال کیا بتاؤں جس کو حال پوچھنا چاہیے جب اسے ہی اس کی پرواہ نہیں ہے تو میں کسی دوسرے کو حال بتانے کو تیار نہیں ہوں۔ کہا کہ مائی وہ کون ہے کہ جس کے ذمہ تمہارا حال پوچھنا تھا۔ کہا کہ وہ جو زمامِ خلافت اپنے ہاتھ میں کے بیٹھ گیا ہے وہ جس نے پہلے اپنے خطبے میں یہ اعلان کیا تھا کہ اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی ذمہ داری مجھ پہ عائد ہوگی۔ یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ میری مصیبت کا پوچھتا۔ میں سمجھتا ہوں اتنے سے ہی کچھ کم اوس نہیں پڑی ہوگی کہ آپؓ نے اگلی بات بھی کہدی کہ مائی تم نے اپنی مصیبت کا حال اس تک پہنچایا تھا؟ اور آگے جواب عمرؓ کی زبانی سنیے جو ساری عمر دہراتے رہے اس جواب کو اور روتے رہے۔ کہا کرتے تھے کہ مجھے اس بڑھیا نے بتایا کہ یہ خلافت کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے' اُس نے کہا کہ یہ اس تک حال پہنچانا میرا فریضہ نہیں تھا یہ اس کا فریضہ تھا کہ وہ ایک ایک فرد کے متعلق باخبر رہتا۔ اور آگے کہا کہ اس نے کہا تھا

کہ جو خدائے خبیر کے نام پر ہم سے اطاعت لیتا ہے اسے اتنا خبیر ہونا چاہیے کہ ہر فرد کی خبر اس کے پاس موجود ہو۔ کہتا ہوں کیا تعلیم حضور ﷺ دے گئے تھے اس قوم کو' کیا قرآن سمجھا گئے تھے اس قوم کو۔ یہ لفظ تو ہمارے ہاں متواتر چلا آیا خدا کے نام پر حکومتِ الٰہیہ جسے ہم کہتے ہیں خدا کے نام پر حکومت قائم کرنا۔ پوچھو اس بڑھیا سے کہ وہ کیا بات سمجھی تھی۔ خدا کے نام پر حکومت قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں انسانوں کے متعلق وہ ذمہ داریاں ان کے ہاتھوں سے پوری ہونگی۔ وہ خبیر ہے وہ خدا' ان کی ذمہ داری ہے کہ یہ خبیر ہوں ساری مملکت کے لیے۔ ساری عمر روتے رہے حضرتِ عمرؓ اس کے بعد' کہا خلافت کی ذمہ داری اس بڑھیا نے مجھے سمجھائی تھی کہ یہ ہونا چاہیے۔ اور یہ جو بات میں نے کہدی ہے کہ خدا نے جو ذمہ داریاں لے رکھی ہیں وہ ان کے ہاتھوں سے پوری ہوتی ہیں' ان کی ذمہ داریاں وہ ہوجاتی ہیں۔ یہ چیزیں بھی کوئی ہمارا بعد کا تراشیدہ فلسفہ نہیں۔

مملکتِ اسلامیہ کی ذمہ داریوں کا تعین اور انہیں پورا کرنے کا طریق

عزیزانِ من! یہ بھی تو قرآن ہی سے حاصل کردہ بصیرت اور علم ہے اسے بھی تو عمرؓ نے ہی سمجھایا تھا۔ یہ چیز کہ خدا براہِ راست ذمہ داریاں پوری نہیں کیا کرتا۔ وہ تو دیگر آیات کے علاوہ سورۃ یٰسٓ کی تو وہ آیت سامنے لائیے کہ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ بھوکوں کی روٹی کا کچھ انتظام کرو تو یہ کہتے ہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ رزق کی ذمہ داری تو خدا نے لے رکھی ہے اگر اسے یہ مقصود ہوتا کہ یہ بھوکے نہ رہیں تو وہ انہیں روٹی کیوں نہ دیتا۔ تم کیا کہتے ہو اس کی ذمہ داری کو ہم پورا کریں۔ کہا یہ آگے سے جواب دیتے ہیں۔ کہا کس قدر گمراہی میں مبتلا ہیں کہ انہیں پتہ نہیں ہے کہ خدا براہِ راست کسی کے منہ میں آ کے لقمہ نہیں ڈالا کرتا۔ وہ ذمہ داری ان کے ہاتھوں ہی پوری ہوا کرتی ہے جو خدا کے نام پر خدا کی اطاعت لیتے ہیں لوگوں سے۔ یہ چیز تھی۔ اور وہ بات جو میں ابھی کہہ رہا تھا کہ یہ بات بھی عمرؓ نے ہی ہمیں سمجھائی۔ پہلی بات تو میں نے تقدیر کے معاملے میں کہی تھی میں نے عرض کیا تھا کہ میں اس کی مثل ایک فقرہ نہیں جانتا۔ یہ جو دوسری چیز ہے اس نے تو یقین مانئے عمر بھر کے لیے مجھے ایک عجیب وجد کی کیفیت میں رکھا ہوا ہے۔ جب پہلی دفعہ یہ سامنے آئی تھی میں عرض نہیں کرسکتا کہ کتنے دنوں تک مجھ پہ ایک محویت کا عالم رہا تھا۔ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی اس سے پیشتر کہ خدا نے یہ چیز کہی ہوئی ہے کہ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ہر پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ اعتراض دل میں سے یہ اٹھتا تھا کہ روز پکارتے ہیں وہ تو پکار کا جواب نہیں ملتا۔ مصیبت زدہ مصیبت میں گرفتار رہتے ہیں بھوکے بھوکے رہتے ہیں۔ یہ کہاں سے جواب ملتا ہے یہ۔ حضرتِ عمرؓ نے سمجھا دیا۔ اور یہ تو میں کبھی تفصیل میں عرض کرونگا اسلام کا صحیح نظام تو میں نے سمجھا ہی حضرتِ عمرؓ سے ہے۔ سیرتِ انسانیہ کی معراجِ کبریٰ نبی اکرم ﷺ سے سمجھی۔ حوادث کے زمانے میں دین کو مستحکم کس طرح سے رکھا جاسکتا ہے صدیقِ اکبرؓ سے سمجھا۔ اور استحکام کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد یہ نظامِ خداوندی کیسے عملاً متشکل کیا جاتا ہے سیرتِ فاروقیؓ سے سیکھا میں نے۔ سنیے کہ وہ اس مشکل تریں آیت کو سمجھاتے کس طرح سے ہیں۔

خدا سے دعا ہم کب کرتے ہیں؟ جب کوئی ہماری ضرورت رکی ہوئی ہوتی ہے جب کوئی مصیبت آتی ہے جس کا حل نہیں ملتا۔ جب یہ ضرورتیں پوری ہوتی رہیں مشکلات کے حل آتے چلے جائیں ضرورت نہیں پڑتی ہے پھر۔ سنیے ان کا فقرہ۔ کہا کہ خدا نے مجھے یہ ذمہ داری خلافت کی اس لیے سونپی ہے۔

حضرت عمرؓ فاروق کا فرمان کہ جب تم خدا سے دعا کرتے ہو تو یہ میری خدا سے شکایت ہو جاتی ہے

عزیزانِ من! یاد رکھیے گا یہ الفاظ۔ اس لیے سونپی ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک نہ پہنچنے دوں راستے میں روک لوں۔ اگر تمہاری کوئی دعا خدا تک پہنچ گئی تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ میری شکایت ہوگئی کہ جو ذمہ داری اس نے پوری کرنی تھی اس نے نہیں کی اس لیے ہمیں تمہارے ہاں آنا پڑا۔ کہا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے یہ ذمہ داری اس لیے دی گئی ہے۔ چار لفظ ہیں عزیزانِ من! سوچیے کیا کچھ کہہ گئے ہیں یہؓ۔ یہ اس لیے دی گئی ہے کہ میں تمہاری کسی دعا کو خدا تک نہ پہنچنے دوں وہاں تک پہنچی تو میری شکایت ہو جائے گی۔

مملکت پاکستان کے آئین کو عملی شکل دیئے بغیر یہ مملکت اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی

یہاں بات عزیزانِ من! کسی آئین میں لکھ دینے سے نہیں ہے کہ کائنات کا اقتدارِاعلیٰ خدا کا ہے ریاست کا مذہب اسلام ہوگا خدا کی حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ سب کچھ کریں گے۔ ٹھیک ہے آئینی طور پر اس کا اعلان ضروری ہے۔ لیکن اس اعلان کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد خیبر ایسا ہونا پڑے گا جیسا اس بڑھیا نے شام کے دشت میں عمرؓ سے کہا تھا۔ اور اس کے بعد ذمہ دار ایسا ہونا چاہیے تھا کہ جو اس ذمہ داری کے احساس کرنے والے نے یہ کہا تھا کہ مجھے یہ ذمہ داری اس لیے سونپی گئی ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک نہ پہنچنے دوں۔ تمہاری اگر کوئی ضرورت رکی رہے تو پلا پکڑ لو میرا' راستے میں کھڑے ہو جاؤ گریبان پہ ہاتھ ڈال دو گلا دبا دو کہ عمرؓ یہ کیوں نہیں ہوا۔ وہ جو عمرؓ اعلان کرتا ہے کہ دجلہ کے کنارے' مدینے میں بیٹھا ہوا دجلہ کے کنارے' اس دور میں' مملکت کا آخری سرا تھا کوئی انسان بھی نہیں کہ انسان مر جائے' کتا بھی اگر بھوک سے مر گیا۔ اس لیے کہ قرآن نے جہاں یہ کہا ہے کہ خدا کے ذمہ رزق ہے وہاں صرف انسان نہیں کہا وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا کوئی متنفس کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پہ نہ ہو۔ اور یہ ذمہ داری پلٹ کے آجاتی ہے ان کے اوپر جو خدا کے نام پر یہاں مملکت قائم کرتے ہیں۔ اس لیے آپ نے انسان نہیں کہا تھا کتا بھی کہا تھا۔ اور پھر یہ ذمہ داری کی یہ صورت نہیں ہے بھوک سے نہ مر جائے۔ ٹھیک ہے بھوک اور بھوک مٹانے کا فرق ہوتا ہے۔ ہم اگر اپنی میز پہ بیٹھے ہوئے چار چار دس دس؟؟ چیزیں کہتے ہیں ان میں کھانا کھائیں یہ بھی تو بھوک مٹانا ہے۔ اور وہاں جو بیٹھے ہوئے ہیں ان کے لیے اگر ہم اوپر سے تھیلی میں چنے اور اچار لٹکا دیں یہ بھی بھوک سے بچانے کی صورت ہے۔ اس ذمہ دار کی یہی شکل ہوگی بھوک سے بچانے کی؟ ان کی شکل کچھ اور ہوگی۔

حضرت عمرؓ فاروق کے دورِ خلافت کی نوعیت

شکل وہ ہوگی کہ جب وہ شام کا قاصد حضرتِ عمرؓ کے ہاں آ کے بیٹھا ہے تو اسی وقت کھانے کا وقت آ گیا۔ وہاں یہ کسی قسم کا حجاب اور تکلف تو ہوتا نہیں تھا کہ اگر باہر سے کوئی آ کے بیٹھ کے باتیں کر رہا ہے کھانے کا وقت ہو رہا ہے تو ہم نہ اٹھ کے جاتے ہیں نہ وہاں کھانا منگاتے ہیں۔ وہاں آ گیا اور وہیں وہ کھانا آ گیا۔ وہ کھانا اس نے دیکھا جو کی روٹی تھی تھوڑا سا زیتون کا تیل تھا۔ اس نے کہا کہ امیر المؤمنینؓ آپ جو کی روٹی کھا رہے ہیں اب تو مملکت میں اتنا ہوتا ہے کہ آپ گیہوں کی روٹی کھا لیں۔ آپؓ نے کہا کہ مجھے اس وقت یہ تو یقین ہے کہ مملکت میں ہر فرد کو جو کی روٹی مل رہی ہے' کیا تم مجھے یقین دلا سکتے ہو کہ ہر فرد کو مملکت میں گیہوں کی روٹی بھی مل رہی ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں یہ تو میں یقین نہیں دلا سکتا۔ تو کہا کہ پھر مملکت کے امیر المؤمنین پر گیہوں کی روٹی اس وقت جائز ہو سکتی ہے جب مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی ملے۔ اسے وہ آخری شخص ہونا چاہیے کہ جو گیہوں کی روٹی کھائے جب تک پہلے باقیوں کو نہ مل جائے۔ جو کی مل رہی ہے اس کا مجھے اطمینان ہے میں نے کر لیا اطمینان۔ یہ کہ گیہوں کی مل رہی ہے اس کا ابھی انتظام و اطمینان مجھے نہیں ہوا۔ تم نے یہ کہا ہے کہ وہاں کھا رہے ہو تم لوگ' ٹھیک ہے بڑی خوشی کی بات ہے وہاں کھا رہے ہو۔ میں تو اس دن کھا سکونگا کہ جب مجھے یقین ہو جائے کہ ملت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ مساواتِ محمدیہ ﷺ کہا گیا ہے۔

مقامِ آدم اور حوادثِ ارضی وسماوی پر کنٹرول: چین کے دریائے زرد کے متعلق ماؤزے تن کا بیان

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ حوادثِ ارضی وسماوی آتے رہتے ہیں جب تک آدم اس مقام پہ ابھی نہیں پہنچتا اسے تو کہا تھا نا کہ اسم آء کلھا بتا دیے گئے تھے کہ کائنات کے ہر قانون کا علم جب تک ابھی یہ حاصل نہیں کرتا بہت سے گوشے ابھی ایسے ہونگے فطرت کی قوتوں کے جو ہنوز اس کی پہنچ سے باہر ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ علم بڑھتا جائے گا ان میں سے ایک ایک فرشتہ اس کو سجدہ کرتا چلا جائے گا آدم کو۔ لیکن جب تک یہ پورا علم حاصل نہیں ہوتا یا جس نسبت سے کسی قوم کو یہ علم حاصل ہوتا ہے یہ ارضی اور سماوی آفات وحوادث تو آتی رہیں گی۔ سوال آگے یہ ہوگا پھر کہ ان حوادث سے ہم نپٹتے کس طرح سے ہیں کہ یہ کوئی تباہی برپا نہ کریں۔ اور یہ ہے قرآنِ کریم کی تعلیم عزیزانِ من! جو اس نے ہمیں دی۔ پہلی چیز یہ دی کہ یاد رکھو کائنات کی ہر وقت تابع تسخیر ہم نے تمہارے کر دی ہے۔ مطمع نگاہ تو یہ ہے کہ اس طرح سے ان کو کنٹرول کو اپنے لاؤ ان قوتوں کو' کوئی قوت بھی تمہارے اختیار سے باہر نہ ہو۔ طبعی قوانین کے متعلق میں عرض کر رہا ہوں' مومن کا مقام تو بہت بڑا ہے۔؟؟؟ یہ کتاب آئی تھی۔ چین میں یہ دریائے زرد جو ہے اس کی طغیانیوں کا اور ہلاکت سامانیوں کا یہ عالم تھا عام طور پہ ہر سال برسات کے موسم میں اس کا پاٹ قریباً تیس میل تک چوڑا ہو جاتا تھا۔ اور اس نے جب سے تاریخ بنی تھی اس ملک کی' کوئی سال امن سے گذرتا ہی نہیں تھا۔ اس لیے کہ کوئی خاص متعین اس کا رخ نہیں تھا Banks نہیں تھے سواحل نہیں تھے۔ وہ ہر سال اپنا رخ بدلتا تھا اور پھر اس قسم کا بپھرا ہوا دریا جب اپنی مرضی کے مطابق رخ بدلے تو اس کے بعد تو' نہ ترا منزلے باشد نہ مرا'

کوئی محفوظ ہی نہیں رہ سکتا تھا ملک میں ۔ Times Unkonwn سے یہ تباہیاں چلی آ رہی تھیں اس ملک میں اور اس قوم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ صاحب یہ ہمارا مقدر ہی ایسا ہے۔ افیون زدہ قوم تھی۔ اقتدار جب انہوں نے سنبھالا ہے کہ جنہوں نے فطرت کے قوانین کا مطالعہ کر کے اس کی قوتوں کو مسخر کرنے کا ارادہ کر لیا تھا تو وہ بڑا Dramatic انداز ہے کہ جس میں ماؤزے تنگ نے جا کے وہاں سیلاب کے زمانے میں اس کا فقرہ ہے اس کی تقریر کا کہ ''دریائے زرد تم تاریخ انسانیت کی ابتداء سے من مانی کر رہے ہو اب بھی تمہاری یہ صورت ہے کہ تم کسی پابندی کے قائل نہیں ہو۔ اس لیے کہ اب تک اس قوم کے اندر بھی کسی قانون اور ضابطے کی پابندی نہیں ہوتی تھی۔ اب یہاں اقتدار اس قوم کے ہاتھ میں آیا ہے جو قاعدے اور ضابطے کی پابند ہے۔ زرد دریا! اس کے بعد تمہیں بھی قاعدے اور ضابطے کا پابند رہنا پڑے گا' آئندہ سال سے تمہیں ساحلوں کے اندر بہنا ہوگا ساحل سے باہر نہیں جا سکتے''۔ اور آئندہ سال دریائے زرد ساحلوں کے اندر بہتا تھا۔ اب وہ انسان کے مقرر کیے ہوئے راستے میں بہہ رہا ہے۔ انسان تو وہ بلا ہے۔ اس نے جہاں سے دریا نکلتا تھا اور جہاں جا کے گرتا تھا راستے میں جتنی آبادیاں تھیں ان کے حصے میں ٹکڑے کر دیے دریا کے اس حصے کے ایک ایک میل دو دو میل کے۔ ان کے ذمہ یہ لگا دیا کہ تمہاری روٹی کا ذمہ ہمارے اوپر ہے' تمہارا ذمہ یہ ہے کہ اس کے ساحل ایسے بنا دو کہ جتنا جی چاہے بپھر جائے توڑ نہ سکے ان کو۔ اور آئندہ برسات تک دریائے زرد کو لگام دی دی گئی عزیزانِ من!۔ اس میں ابھی ان اقدارِ سماوی پر ایمان کا ذکر نہیں آ رہا کہیں' صرف فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کا ذکر آتا ہے جس کے لیے قرآن نے آدم کہا ہوا ہے مومن نہیں وہاں کہا ہوا۔ یہ مقامِ آدمیت ہے ابھی جہاں فطرت کی قوتیں اس کے تابع تسخیر ہوتی ہیں۔

ہر وہ متنفس جو آدمی کے مقام کے اوپر ہے ایسا کر سکتا ہے۔ ہم تو آدمی کے مقام کے اوپر بھی نہیں پہنچے۔ اور اسی لیے تو اس نے یہ کہا تھا دکھ بھری آواز میں اس قوم کو پکار کے کہ

بہ آدمے نہ رسیدی خدا چہ می جوئی

''او تو تے ججے بندے دا پتر نئیں بنڑیاں تے رب دا مقرب بنن دے تے دعوے کرن ڈیا ہیں توں''۔ آدم کے مقام کے اوپر تو پہنچ اس کے بعد پھر بات کر خدا کی۔ آدمی کے مقام پہ نہیں پہنچا خدا کی بات کیا کر رہا ہے تو۔ کیا عجیب انداز تھا اس شخص کے کہنے کا۔ بہ آدمے نہ رسیدی خدا چہ می جوئی۔ لیکن ہمیں تو یہ خدا کے پرستار جو ہیں آدم کے مقام پہ پہنچنے ہی نہیں دیتے۔

جب کسی بیماری کی تشخیص ہی غلط ہو تو پھر اس کا علاج کیونکر ممکن ہے

جونہی یہ فطرت کی قوتیں' تباہیاں لائیں ہماری نگاہوں کا رخ انہوں نے دوسری طرف موڑ دیا۔ نہ ہمیں اپنی ذمہ داریاں یاد آنے دیں نہ ذمہ دار ارباب کی ذمہ داریاں ان کے سامنے لانے دیں۔ بتایا ہی نہ گیا کہ کن جرائم کی پاداش میں یہ ہو رہا ہے۔ گناہوں کا چرچا ہونے لگ گیا' توبہ اور استغفار کے معنی مسجدوں میں بیٹھ کے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کے تسبیح پھیرنے کا نام ہو گیا تاکہ ادھر ان کی توجہ ہی نہ آئے۔ نتیجہ یہ کہ ہر بار کا سیلاب پہلے سے زیادہ تباہیاں لانے والا بن گیا۔ کیا ہی

یہ تھا ابلیسی سازش نے جو اقبالؒ کہہ گیا ہے کہ راز اس کا' وہ کہتا تھا کہ میں اس امت کی بیداری سے ڈرتا ہوں ابلیس نے کہا تھا اپنے مشیروں سے کہ ابلیس کے نقطۂ نگاہ سے حقیقی فتنہ جو ہے وہ مزدکیت فتنۂ فردا نہیں' اسلام ہے۔ ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں۔ تو انہوں نے یہ پوچھا تھا کہ پھر ہم کیا کریں کہ یہ امت بیدار نہ ہونے پائے مقامِ آدمیت پہ بھی نہ آنے پائے۔ اس نے کہا تھا کہ پروگرام اس کے لیے یہ ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

ارضی یا سماوی تباہ کاریوں کا علاج تسبیح کے دانوں کی بجائے کائناتی قوتوں کو مسخر کرنے میں ہے

سیلاب آتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں تسبیحاں دیدو' انہیں یہ کہدو کہ ان کے گناہوں کی وجہ سے آیا' جرائم کی طرف نگاہ نہ جانے دو۔ اس طرف نظر نہ اٹھنے دو کہ کس نے اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا جس کی وجہ سے یہ قوم تباہ ہوگئی۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

ایک ایک مہرہ مات ہوتا چلا جا رہا ہے عزیزانِ من! ۔مشرقی پاکستان کی بساط پہ ہمارے مہرے جس طرح سے مات ہوئے تھے' یہاں آنے کے بعد جس طرح ایک ایک مہرہ مات ہو رہا ہے۔

مملکتِ پاکستان کے متعلق ہندو ذہنیت کبھی نہیں بدل سکتی

عزیزانِ من! بھکاریوں کی قوم کی طرح اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ اس 1971ء کی جنگ کے بعد کے عواقب میں جو کچھ ہمارے ساتھ آج ہو رہا ہے' جس طرح سے وہاں وفد جا رہے ہیں ہمارے' جس طرح سے یہ مذاکرات' مذاکرات کیا ہو رہے ہیں جس طرح سے ہر بار ہم خود فریبی میں مبتلا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آج صبح کے اخبار میں یہ کچھ تھا جس سے تڑپ اٹھا تھا کہ اتنے لمبے چوڑے مذاکرات کے بعد بات پھر وہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ نہیں ہندو کی ذہنیت ہمیں کسی فیصلے کی طرف نہیں آنے دیتی ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے عزیزانِ من! ہندو کی ذہنیت۔ ہندو نے تو پاکستان بننے کے بعد جواہر لال نہرو نے اپنی تقریر میں یہ بات کہی تھی کہ ٹھیک ہے آج جناحؒ کو یہ کچھ کر لینے دیجیے' کچھ زیادہ عرصہ نہیں لگے گا کہ اس کے بعد ہم پھر اکھنڈ بھارت بنا دیں گے۔ جن کے عزائم یہ ہوں ان سے ہم خیر کی توقع کر سکتے ہیں؟۔ عزیزانِ من! کسی سے بھی یہاں خیر کی توقع نہیں ہو سکتی اپنے ہی حسنِ عمل سے یہ چیز ہو سکتی ہے۔ اور پھر حسنِ عمل کے اندر فریب میں نہ آ جایئے۔ قرآن نے پہلی بات کہی تھی کہ اپنی سرحدوں کو اتنا مضبوط رکھیے کہ تم یہاں بیٹھے ہو اور مخالفین کے دل وہاں کانپ رہے ہوں تمہاری وجہ سے۔ یہ کہا تھا اس نے۔ مومن کے متعلق یہ کہا تھا (و یقتلون و یقتل) مومن کی زندگی یہ ہے کہ اس حفاظت کے لیے وہ

ہر وقت تیار ہوتا ہے میدانِ جنگ میں جانے کے لیے۔ وہاں دو ہی شکلیں قرآن نے بتائی ہیں تیسری شکل ہے ہی نہیں عزیزانِ من! یا وہاں وہ اپنی جان دیدیتا ہے یا غالب اور منصور واپس آتا ہے۔ اب بھی یہی چیز اس مسئلہ کوحل کر سکے گی عزیزانِ من! آج بھی یہی ایک حل ہے کوئی دوسرا حل اس کا نہیں ہے۔(و یقتلون و یقتل)۔لیکن اس کے لیے تو قرآن نے شرط لگائی تھی کہ اس کے لیے اس انداز میں میدانِ جنگ میں لڑنا ہوگا پوری قوم کو۔ وہاں تو سپاہی الگ ہوتا ہی نہیں ہے۔

میدانِ جنگ میں مومن کی سراپا زندگی سیسہ پلائی دیوار کی مانند ہوتی ہے

قرآن کی رو سے تو ہر مسلمان سپاہی ہوتا ہے۔ان کے لیے کہا تھا (مرصوص) قوم کو یوں ہونا چاہیے جیسے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو۔ اینٹ کی بھی دیوار نہیں کہ دو دیواروں کے اندر تھوڑا سا یونہی رخنہ ہوتا ہے۔ جیسے سکہ ڈھال کے ایک دیوار بنائی ہوئی ہو عزیزانِ من! یہ مثال تھی قرآن میں۔قوم کے اندر اس قسم کی باہمی فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ دلوں کی دیواریں اس طرح سے ملی ہوئی ہوں پوری قوم کے اندر۔ اور پھر ایک ہی زندگی کا مقصد ہو یا وہاں سے غالب اور منصور لوٹنا ہے یا جان دیدینی ہے۔عزیزانِ من! وہاں آپ ایک ہندو کہہ رہے ہیں۔ ایران اور روما جیسی طاقتیں مٹھی بھر عربوں کا ایک میدان میں مقابلہ نہ کر سکیں۔لیکن یہ جو آفتیں آتی ہیں ان کا علاج عزیزانِ من! یہ علاج ہوگا کہ ہر وقت Vigilance رہے۔ کوئی اور نہیں مارتا عزیزانِ من! (وَمَاۤ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ) قرآن کہتا ہے جو مصیبت تم پہ آتی ہے تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ مصیبت آئے تو ڈھونڈو ان ہاتھوں کو جن کی وجہ سے وہ مصیبت آئی ہوئی ہوتی ہے۔

آخر پر علامہ پرویزؒ کی ایک دردمندانہ اور حقائق پر مبنی اپیل

یہ ہے عزیزانِ من! میرا آج کا پیغام۔ اور پھر دہرا دوں ہم جو بچ گئے ہیں ان مصیبتوں سے ان کے لیے جو ابھی سانس لے رہے ہیں ان آفتوں کے اندر۔ ان کے لیے جو کچھ ہم سے ہوسکتا ہے ہم کریں اور اس انداز سے کریں کہ ان کو اس کا احساس نہ ہونے پائے کہ ہمیں خیرات دی جا رہی ہے۔ ان کی طبعی زندگی کو بچانے کے لیے ان کی انسانی زندگی کی موت جو ہے اس کو نہ خریدنے دیجیے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق دے۔ بات میں نے درس کی اس آیت سے شروع کرنی تھی لیکن آج اس موضوع سے زیادہ موزوں موضوع ہو نہیں سکتا۔ اور آج کیا ابھی تو پتہ نہیں ہمیں کب تک یہ چیزیں جو ہیں یہ دہرانی پڑیں گی۔ یا اللہ! ہمیں وہ نگاہ دیدے کہ ہم ایسے اوقات میں ان اسباب کو دوسروں کی طرف تلاش کرنے کی بجائے اپنے ہاں تلاش کیا کریں۔ دوسروں کو ذمہ دار قرار دینے کے لیے ہم خود سوچا کریں کہ ہم کس قدر ذمہ دار ہیں۔ پھر توفیق دیدے کہ اس کے بعد ہم یہ چیز عزم کریں اس بات کا کہ اس دفعہ یہ ہو گیا ہے اس کے بعد ایسا نہیں ہوگا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّاؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہودیوں کی حکومت کیسے بن گئی؟؟؟

سورہ فاتحہ میں ''غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ''۔ کے سلسلہ میں ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں مَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ سے مراد یہودی ہیں اور ضَّآلِّيۡنَ سے مراد عیسائی۔ قرآن کریم کی رو سے یہ تخصیص صحیح نہیں۔ اس میں متعدد مقامات پر بتایا گیا ہے کہ غضب خداوندی کے مستوجب کون لوگ ہوتے ہیں۔۔ یا یوں کہیئے کہ وہ کون سے جرائم ہیں جن کا نتیجہ خدا کا غضب ہوتا ہے اور راستے سے بھٹک جانے والے (ضَّآلِّيۡنَ) کون۔ بنابریں' سورہ فاتحہ میں مذکور (الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ اور ضَّآلِّيۡنَ) میں وہ تمام افراد اور اقوام شامل ہیں جن پر قرآن کی رو سے ان اصطلاحات کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہم ان مقامات میں سے (مثال کے طور پر) صرف دو ایک درج ذیل کرتے ہیں۔ سورہ انفال میں جماعت مومنین کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ جب میدان جنگ میں تمہارا مقابلہ دشمن سے ہو تو وہاں سے پیٹھ دکھا کر مت بھاگ اٹھو۔ یاد رکھو' جو ایسا کرے گا۔ فِئَةٍ فَقَدۡ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاۡوٰهُ جَهَنَّمُ (8:16)۔ وہ غضب خداوندی کا مستحق ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔'' سورہ نساء میں ہے۔

وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا (4:93)۔

جو کسی مومن کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اسکی لعنت ہوگی اور اس کے لئے سخت عذاب تیار کیا گیا ہے۔

لہٰذا' یہ سمجھنا کہ قرآن کریم کی رو سے ''الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ'' سے مراد صرف یہودی ہیں' خود فریبی ہے۔

یہودیوں کے متعلق بھی قرآن کریم میں ہے کہ وہ اپنے متعدد جرائم کی وجہ سے خدا کے غضب کے مستحق قرار پا گئے تھے۔ مثلاً جب انہوں نے (حضرت موسیٰؑ کی عارضی غیر حاضری کے دوران) گوسالہ پرستی شروع کر دی تو اس پر کہا گیا کہ۔۔ سَيَنَالُهُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَذِلَّةٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا۔۔۔(7:152)۔ ان پر خدا کا غضب ہوگا۔ یعنی وہ اس دنیا میں ذلیل ہوں گے۔ لیکن اس سے اگلی آیت میں ہے کہ جو لوگ جرم کرنے کے بعد اس سے تائب ہو کر صحیح روش اختیار کر لیتے ہیں'

انہیں حفاظت اور مرحمت نصیب ہوجاتی ہی چنانچہ اس کے بعد یہودیوں نے ایسا ہی کیا اور انہیں حکومت وسطوت نصیب ہوگئی۔ اسی سینا کے صحرا میں انہوں نے احکام خداوندی سے اعراض اور سرکشی کی راہیں اختیار کیں تو اس پر کہا گیا کہ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ ۚ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ (2:61)۔ ان پر ذلت اور مسکنت کی مار ماری گئی اور اس طرح خدا کا غضب ان پر وارد ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ ذلت ومسکنت کی یہ سزا بھی وقتی تھی۔ کیونکہ اس کے بعد انہیں نہ صرف فلسطین کا علاقہ ہی ملا بلکہ وہ سطوت داؤدی اور شوکت سلیمانی کے بھی وارث ہوئے۔

اس کے بعد ان میں پھر خرابیاں پیدا ہونا شروع ہوگئیں تو ان پر دو دفعہ ایسی تباہی کا عذاب آیا جس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی۔ ان کی پہلی تباہی بابل کے مستبد شاہنشاہ بخت نصر کے ہاتھوں (چھٹی صدی قبل مسیح میں) ظہور میں آئی۔ لیکن اس کے بعد ایران کے شاہنشاہ کیخسرو نے انہیں دوبارہ یروشلم میں بسا دیا اور دوسری تباہی 70ء میں رومیوں کے گورنر ٹائیٹس کے ہاتھوں ہوئی جس کے بعد انہیں پھر سرفرازی کی زندگی نصیب نہ ہوئی۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۴۔۷ میں ان دونوں تباہیوں کا ذکر آیا ہے۔

نزول قرآن کریم کے وقت ان سے کہا گیا کہ اگر تم خدا کی ان صداقتوں پر ایمان لا کر اپنی روش میں تبدیلی کرلو تو تمہاری ذلت کی زندگی ختم ہوسکتی ہے۔ لیکن انہوں نے اس موقعہ کو بھی ہاتھ سے گنوا دیا۔ اور بدستور غضب خداوندی کے مورد بنے رہے۔ اس سلسلہ میں سورہ بقرہ میں کہا گیا کہ اس سے فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ (2:90)۔ وہ پہلے ہی (اپنے سابقہ جرائم کے نتیجے میں) مغضوب علیہ تھے۔ اس انکار وسرکشی سے اس میں اور اضافہ ہوگیا۔

انہوں نے نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کی صداقتوں سے انکار کیا بلکہ (مدینہ میں) اسلامی مملکت کے امن پسند شہریوں کی حیثیت سے بھی رہنا پسند نہ کیا۔ انہوں نے مملکت کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ مسلمانوں سے عہد شکنی کی۔ پھر کھلے بندوں میدان جنگ تک میں مقابلہ کے لئے آ گئے۔ اس مقام پر جماعت مومنین سے کہا گیا کہ ان کی ان حرکات سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ان کا ہر منصوبہ ناکام رہے گا۔ انہیں ذلت آمیز شکست ہوگی، اور بری طرح سے خوار ہوکر یہاں سے نکلیں گے۔ اس سلسلہ میں سورہ آل عمران میں کہا گیا کہ ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا یہ جہاں بھی جائیں گے، ذلت وخواری ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ بجز اس کے کہ کسی نے انہیں اہل کتاب سمجھ کر خدا کے نام پر پناہ دے دی یا انہوں نے ویسے ہی کسی قوم سے معاہدہ کرلیا۔ ورنہ عام حالات میں ان کی کیفیت یہی رہے گی کہ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ ؕ (3:111) خدا کا غضب ان پر مسلط رہے گا اور اس طرح یہ ذلت ومسکنت کی زندگی بسر کریں گے۔ چنانچہ پہلے انہیں مدینہ سے نکالا گیا، پھر خیبر سے اور ازاں بعد پورے کے پورے جزیرہ نمائے عرب سے انہیں باہر نکال دیا گیا۔ صفحۂ ارض پر کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں یہ باعزت زندگی بسر کر سکتے۔ عیسائی ان کے شدید ترین دشمن تھے۔ کیونکہ وہ انہیں حضرت مسیح کے صلیب دیئے جانے کے مجرم قرار دیتے تھے اور مسلمانوں

کی مملکت کے خلاف انہوں نے یہ کچھ کیا تھا۔ لہٰذا ان کے لئے کہیں ٹھکانا ہی نہیں رہا تھا۔

آپ نے دیکھا کہ ان آیات میں نزول قرآن کریم کے زمانے تک یہودیوں کی ذلت آمیز زندگی کا ذکر ہے۔ یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ابدالآباد تک ان کی یہی حالت رہے گی۔ بلکہ خود اسی آیت میں "الا بحبل من اللّٰہ وحبل من الناس۔" کہہ کر ان کی ذلت سے بچ جانے کی ایک امکانی شکل کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

انہوں نے اپنی فلسطینی زندگی کے زمانے میں سرکشی اور قانون شکنی کی جو زندگی اختیار کر رکھی تھی، اس سلسلہ میں سورہ اعراف میں ہے۔

وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبۡعَثَنَّ عَلَيۡهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ مَنۡ يَّسُوۡمُهُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ ؕ (7:167)

اور جب تیرے رب نے (بذریعہ وحی) اعلان کر دیا کہ وہ ان پر "قیامت کے دن تک" ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو انہیں سخت سزائیں دیا کریں گے۔

اس آیت میں "اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ" (قیامت کے دن تک) کے الفاظ سے یہ دلیل لائی جاتی ہے کہ یہ قیامت تک ایسے لوگوں کی محکومی میں رہیں گے جو انہیں بری طرح ستائیں گے۔ اس لئے ان کی اپنی حکومت کبھی قائم نہیں ہوگی۔

ہم اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ قرآن کریم کی رو سے "قیامت" کا تصور کیا ہے اور يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ سے مراد کیا، اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہہ دیتے ہیں کہ "تم قیامت تک ایسا نہیں کر سکو گے" اور اس طرح اس سے یا تو شدت مراد ہوتی ہے یا لمبا عرصہ۔ اسی طرح قرآن کریم میں بھی "اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ" استعمال ہوا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں عیسائیوں کے متعلق ہے کہ فَاَغۡرَيۡنَا بَيۡنَهُمُ الۡعَدَاوَةَ وَالۡبَغۡضَآءَ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ (5:14)۔ ہم نے ان میں "قیامت کے دن تک" باہمی بغض و عداوت ڈال دی۔ اسی طرح یہودیوں کے باہمی اختلاف کے متعلق بھی انہی الفاظ میں کہا گیا ہے (5:64)۔ "اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ" تو خیر پھر بھی ایک محدود مدت ہے، قرآن کریم میں تو "ابد" کا لفظ بھی لامتناہی مدت کے بجائے "لمبے عرصے" کے لئے استعمال ہوا ہے۔۔ بلکہ ان معنوں میں جن میں ہم کہتے ہیں کہ "میں کبھی ایسا نہیں کروں گا"۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ اور ان کے رفقاء کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ "تم میں اور ہم میں باہمی عداوت ہوگی۔ اَبَدًا (60:4) لیکن اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ حَتّٰى تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ (60:4) تا آنکہ تم اللہ پر ایمان نہ لے آؤ۔ یہی مراد "یہودیوں پر ان کے دشمنوں کے تسلط" "تا قیامت" سے ہے۔ یعنی ان پر وہ لوگ مسلط رہیں گے، تا آنکہ یہ اپنی غلط روش کو نہ چھوڑ دیں۔ خود وہ آیت جس میں یہودیوں پر ان لوگوں کے تا قیامت مسلط رہنے کا ذکر ہے، اس مفہوم کی تائید کرتی ہے۔ اس میں یہ کہہ کر کہ ان لوگوں پر وہ مسلط رہیں گے، یہ کہا گیا کہ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيۡعُ الۡعِقَابِ خدا کا قانون مکافات غلط اعمال کا بہت جلد بدلہ دے دیا کرتا ہے اور اس کے بعد ہے۔ وَاِنَّهٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (7:167) اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ سامان حفاظت و مرحمت بھی عطا کرنے والا ہے۔ یہ الفاظ اس پر

دلالت کرتے ہیں کہ یہود پر بازآفرینی کے دروازے ابدی طور پر بند نہیں ہو گئے تھے۔ انکے لئے حفاظت طلبی کے راستے کھلے تھے۔

اس سے اگلی آیت میں بات اور بھی واضح کر دی جہاں کہا کہ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ان کے جرائم کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی۔ ان کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ مختلف گروہوں میں بٹ کر زمین میں منتشر ہو گئی مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ یہ نہیں تھا کہ ان کی ساری قوم میں کوئی بھی فرد صالح نہیں تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے اور کچھ لوگ ویسے وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ ان کی تاریخ میں' ان کے لئے بگڑنے اور سنورنے کے مختلف مواقع آتے رہے۔ یہ اس لئے کہ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (7:168)۔ تاکہ یہ اپنی غلط روش کو چھوڑ کر صحیح راستے کی طرف آ جائیں۔ اور اس طرح اپنی ذلت و محکومی کو پھر سے عزت اور وقار میں بدل سکیں۔ ''لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ'' کے الفاظ نے ساری بات واضح کر دی۔ یعنی یہ کہ ان پر ان کی بازآفرینی کے دروازے ابدی طور پر بند نہیں ہو چکے تھے۔ ان کے لئے اس کا امکان باقی تھا۔

جیسا کہ ہم نے سابقہ اشاعت میں لکھا تھا۔ اگر کسی قوم کا اجتماعی تشخص ہی نہیں مٹ چکا' تو اس کے لئے دوبارہ زندگی حاصل کرنے کا موقعہ ہر وقت موجود ہوتا ہے' یہ خدا کے قانون مکافات کے خلاف ہے کہ کسی قوم کے اسلاف نے دو ہزار سال پہلے کچھ جرائم کئے ہوں' تو ان کی موجودہ نسل سے کہہ دیا جائے کہ تم جو کچھ جی میں آئے کرلو' تم اپنی ذلت کی زندگی کو بدل ہی نہیں سکتی یہ عقیدہ عیسائیت کا ہے جس کی رو سے کوئی انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ (آدم وحوا) کے گناہ کے داغ کو دھو ہی نہیں سکتا۔ قرآن کریم اس تصور کو باطل قرار دیتا ہے۔ حکومت وسلطنت حاصل کرنے کے لئے کچھ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو قوم بھی ان صلاحیتوں کو پیدا کر لے گی' اسے حکومت مل جائے گی۔ جس میں وہ صلاحیتیں باقی نہیں رہیں گی' ان سے حکومت چھن جائے گی۔ ان صلاحیتوں کے باقی نہ رہنے سے قوموں کی حالت کیا ہو جاتی ہے' اس کا اندازہ دو ایک تاریخی واقعات سے لگایئے۔۔ یورپ کی عیسائی سلطنتوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنایا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ فلسطین کے ان مقامات کو جنہیں وہ مقدس سمجھتے تھے' مسلمانوں کے قبضے سے چھین لیں۔ قریب دو سو سال تک ان جنگوں کا سلسلہ (جنہیں صلیبی جنگیں کہا جاتا ہے) جاری رہا۔ لیکن وہ مسلمانوں کو شکست نہ دے سکے۔ اس کی وجہ ایک فرانسیسی مصنف (ژواین ویل) کی زبان سے سنئے۔ جو خود اس جنگ میں شریک تھا۔ وہ مصر کے محاذ کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ:

> ایک رات جب ہم ان برجیوں پر جو دریا کے راستے کی حفاظت کے لئے بنائی گئی تھیں' پہرہ دے رہے تھے تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک انجن سالا کر نصب کر دیا اور اس سے ہم پر آگ پھینکنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر ہمارے لارڈ والٹ نے ہم سے یوں خطاب کیا۔۔ ''اس وقت ہماری زندگی کا سب سے بڑا خطرہ پیش آ گیا ہے......ایسی حالت میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو ہمارا بچاؤ کر سکے۔ آپ لوگوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ جونہی مسلمان آگ کے بان چلائیں ہمیں چاہئے کہ ہم گھٹنوں کے بل جھک جائیں' اور اپنے نجات دہندہ خداوند سے دعا کریں کہ

اس مصیبت میں ہماری مدد کرے۔'' چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے آگ کے یہ شعلے ہم پر برستے رہے اور ہم ہر شعلہ پر گھٹنوں کے بل جھک کر خدا سے دعائیں مانگتے تھے۔حتیٰ کہ ہمارے ولی صفت بادشاہ کی بھی یہ حالت تھی کہ وہ جب اس شعلہ کی گرج سنتا تو بستر سے اٹھ کھڑا ہوتا۔ اور روتے ہوئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ہمارے نجات دہندہ سے التجائیں کرتا۔

وہ یہ دعائیں کرتے رہے اور آگ کی اس بارش نے ان کی تمام برجیوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔

یہ تیرھویں صدی میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی کیفیت تھی۔ اس کے پانچ سو سال بعد' جب اٹھارہویں صدی میں' نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے جامعہ ازہر کے علماء کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ان علماء نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ ہمیں جامعہ ازہر میں' بخاری شریف کا ختم شروع کر دینا چاہئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔لیکن ہنوز بخاری شریف کا ختم' اختتام تک بھی نہ پہنچنے پایا تھا کہ مصر کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔

یہ اٹھارہویں صدی کا ذکر ہے۔انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا ہے تو امیر بخارا نے حکم دے دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ''ختم خواجگان'' پڑھا جائے۔ چنانچہ ادھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں' ادھر ختم خواجگان میں لوگ بیٹھے یا مقلب القلوب' یا محول الاحوال کے نعرے بلند کر رہے تھے لیکن توپیں جیت گئیں اور یہ دعائیں ان کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں۔

(بحوالہ: غبار خاطر' مولانا آزاد مرحوم)

اور یہ کچھ مصر اور بخارا تک ہی محدود نہیں۔اب تو ہمارا عام شیوہ یہ ہو گیا ہے کہ ادھر کوئی قومی مصیبت آئی' اور ادھر ہم نے مسجدوں میں دعائیں مانگنا' مناجاتیں پڑھنا اور اذانیں دینا شروع کر دیں۔۔سکولوں میں آیۃ الکرسی کے ورد کے لئے چاندنیاں بچھ گئیں اور مزاروں پر ختم خواجگان شروع ہو گئے آپ نے جمعہ کے ہر خطبہ میں خطیب صاحب کو یہ کہتے سنا ہو گا کہ اللھم دمر دیارھم یااللہ! تو اسلام کے دشمنوں کی بستیوں کو تباہ کر دے اللھم شتت شملھم یااللہ! تو ان کی اجتماعیت کو منتشر کر دے۔ہم صدیوں سے اپنے خطبوں میں یہ دعائیں مانگتے اور سامعین ان پر نہایت خشوع وخضوع سے آمین' اللھم آمین کے نعرے بلند کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور اسلام کے دشمنوں کی بستیاں دن بدن ترقی کرتی اور ان کی اجتماعیت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔اذانوں میں بے شک زلزلہ انگیز قوت اور دعاؤں میں لاریب جمعیت خاطر کا سامان ہوتا ہے لیکن انہی کی اذانوں اور دعاؤں میں جن کے بازو خارا شگاف اور جن کے حوصلے آہن گداز ہوں۔

قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں!

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر

12 مارچ 2017ء کے کئی اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ جناب وزیر اعظم صاحب نے لاہور کی ایک جامعہ میں ان کے سالانہ سیمینار میں شرکت فرمائی ہے وہاں انہوں نے اس سیمینار سے خطاب بھی فرمایا ہماری رسائی صرف انگریزی اخبارات تک ہے جن میں ان کی Verbatim تقریر تو نہیں آئی البتہ ان کی تقریر کا ملخص آیا ہے۔ ان کی گفتگو کا مدعا یہ تھا کہ اب تک دنیا میں جو نظام چلے آ رہے ہیں، یا اسلام کے نام پر جو نظام چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ تمام نظام ناکام ہو چکے ہیں، اور دہشت گردی پر مبنی ہیں۔ انہوں نے علماء کرام سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ اسلام کا اصلی نظام پیش کریں جو امن پسندی، سلامتی اور محبت پر استوار ہو۔ اس رسالہ کا کوئی تعلق عملی سیاست یا سیاستدانوں کی ذات یا ان کے خیالات سے نہیں ہے۔ لیکن چاروں طرف سے یہی پکار ہے اور ساری دنیا ایک پُرسکون نظام کی تلاش میں ہے۔ سابق وزیر اعظم ایک سیاسی شخصیت ہیں اور سیاسی شخصیات اپنے مفادات کے حوالہ سے ہی تقاریر کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ان کے خطاب سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ البتہ جو کچھ انہوں نے اپنے خطاب میں فرمایا تھا، وہ عام لوگوں کی بھی خواہش ہے اور ہر شخص ایک نئے پُرامن نظام کی تلاش میں ہے اور پرانے نظاموں سے بیزار ہے۔ ہم اس مضمون میں عوام کی خواہش کے پیشِ نظر چند گذارشات کریں گے۔ البتہ اسلام کے اصلی اور حقیقی نظام کی تلاش میں صاحب جہاں تشریف لے گئے ہیں، اور جس مقام سے انہوں نے اسلام کا اصلی نظام کے ملنے کی توقع کی ہے، اس سے ان کی کوتاہ نظری اور خوش فہمی ظاہر ہوتی ہے۔ جبکہ یہی وہ مقام یہی وہ طبقہ ہے جو اسلام کے ترقی پذیر، اور انسانیت ساز نظام کے قیام میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ہمارے ''علماء کرام'' کے نظریات ہی اقامت دین میں مانع ہیں۔ یہ بات ہم مضمون کے آخر میں عرض کریں گے۔ ہم پہلے اسلام کا اصلی نظام پیش کرتے ہیں۔

> اس وقت جس نظام کے لئے دنیا ترس رہی ہے وہ قرآن کا ہی وہ نظام ہے جو دنیا میں امن وسکون قائم کرسکتا ہے

یہ بات واضح رہے کہ اس وقت ساری دنیا میں کسی مقام پر بھی اسلامی نظام جاری نہیں ہے۔ نہ پاکستان میں اور نہ

عرب میں۔ یہ سب مسلم مملکتیں ہیں۔ اس وقت جس نظام کے لئے دنیا ترس رہی ہے وہ قرآن کا ہی وہ نظام ہے جو دنیا میں امن وسکون قائم کرسکتا ہے۔ مسلمان ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ دین، اس کا نظام، انسانی ذہن کے وضع کردہ تمام نظاموں سے بہتر ہے فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى (2:256)، جو قوم غیر خداوندی نظام سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظام کی صداقت پر ایمان لے آئے اور اُسے ہی اپنی اپنی زندگی کا نصیب العین بنالے تو سمجھ لو کہ اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا پکڑ لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

> اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ ''المومن'' اور السلام'' بڑی نمایاں ہیں، ہر شخص کو اپنی پناہ میں لے کر اس کو سلامتی مہیا کرنا، ہر طرح کا تحفظ دینا ہر مسلمان اور ہر اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے

سب سے پہلی بات جو اقامت دین کے بارے میں پیش نظر رکھنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کے قیام میں تشدد یا زبردستی کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ بار بار، اور جگہ بہ جگہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ ایمان اور عملِ صالح کا نتیجہ از خود غلبہ اور امن حاصل ہونا ہے، ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمۡ دِيۡنَهُمُ الَّذِى ارۡتَضٰى لَهُمۡ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا ؕ يَعۡبُدُوۡنَنِىۡ لَا يُشۡرِكُوۡنَ بِىۡ شَيۡـئًا ؕ وَمَنۡ كَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۝55
(24:55)

ترجمہ: تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے کام کئے ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو روئے زمین پر ضرور اقتدار دے گا جس طرح ان لوگوں کو غلبہ دیا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں اور جس دین کو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا۔ اس پر اُنہیں ضرور قدرت دے گا اور ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا کہ وہ میری اطاعت کریں اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں اور جو شخص اس کے بعد بھی کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسقین ہے۔

قرآن کی رو سے حکومت اور حکومت میں فرق ہوتا ہے۔ جو حکومت ایمان اور اعمالِ صالح کے نتیجے میں ملتی ہے وہ خلافت کہلائی جاتی ہے اور جو حکومت تلوار کے زور پر حاصل ہوتی ہے وہ ملوکیت اور سلطنت کہی جاتی ہے لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ خلافت وہ نظام ہے جو ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ذریعے ملتا ہے اور ملوکیت وہ حکومت ہے جو تلوار کے زور پر ملتی ہے۔ نیز یہ کہ یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی کسی کے محکوم ہوں گے تو ان کا ایمان نہ قرآنی ایمان ہے نہ ان کے اعمال

قرآن کی رو سے اعمالِ صالح ہیں۔ بلکہ وہ صرف ایک دھوکہ میں مبتلا ہیں۔

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ ۔۔۔ان کا خوف امن سے بدل جائے گا۔اس سے بڑی اور نعمت اس دنیا میں اور کونسی ہوسکتی ہے کہ اس نظام میں چاروں طرف امن وسلامتی ہوجائے۔قرآن کہتا ہے کہ خوف کی جگہ امن میں تبدیل ہوجائے گی۔يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ (24:55) یہ صرف ہمارے قوانین کی اطاعت کریں گے اور وہ کسی اور کی اطاعت کو ہماری اطاعت میں شامل نہیں کریں گے۔

قرآن کریم جو Narrative دیتا ہے اس نے اس کو کلمہ طیبہ کہا ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (35:10)، یہ جو خدا کے کلمات یا نظریات زندگی ہیں، جن کو اس موجودہ دور میں اسلامی مملکت کہتے ہیں اسی کو قرآن نے دوسرے مقام پر شجر طیب کہا ہے (14:24) جس میں خوش گوار پھل آتے ہیں۔

یہ بھی اعمال صالحہ کے ذریعہ ہی قائم کیا جاسکتا ہے وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ (35:10) ترجمہ اور اعمال صالح اس کو بلند کرتے ہیں۔آپ غور فرمائیں کہ قرآنِ کریم ہر جگہ واضح طور پر اعمالِ صالحہ کو ہی اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ بناتا ہے۔

مکہ اسلامی نظام کے مرکز کی ایک علامت ہے اور قرآن نے اس کو اس معنی میں استعمال کیا ہے۔کعبہ بظاہر اینٹ پتھر کی ایک عمارت ہے قرآن نے فرمایا اس میں آیات بینات ہیں (3:97)، کسی عمارت میں آیات بینات کیا ہوسکتی ہیں۔ظاہر ہے یہ اُن آیات بینات کا ذکر ہے جہاں سے وہ نظام شروع ہوگا اور اس نظام میں یہ واضح نشانیاں ہوں گی۔

مکہ کے متعلق بھی یہی فرمایا کہ اس نظام میں جو مکہ سے شروع ہوگا وہ اس قدر پُرامن ہوگا کہ جو اس نظام میں داخل ہوگیا وہ امن میں آگیا وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (3:97) ترجمہ: جو اس میں داخل ہوگیا وہ امن میں ہوگیا۔

قرآنِ کریم کے مطابق ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ صفاتِ خداوندی کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ پیدا کرے اور اسلامی مملکت کی اساس بھی ان ہی صفاتِ باری تعالیٰ پر ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ ''المومن'' اور السلام'' بڑی نمایاں ہیں، ہر شخص کو اپنی پناہ میں لے کر اس کو سلامتی مہیا کرنا، ہر طرح کا تحفظ دینا ہر مسلمان اور ہر اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے۔جس مملکت کی بنیاد امن وسلامتی، کی اقدار پر بلند ہوتی ہو، اس مملکت سے زیادہ پرسکوں اور کون سی مملکت ہوسکتی ہے۔

قرآنِ کریم کے عطا کردہ Narrative کی علامت اور نشانی یہ ہے کہ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (5:15-16) اے اہلِ کتاب اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی اور ایک ایسی کتاب آچکی ہے جو روشن ہے اللہ اس کتاب کے ذریعے ان لوگوں پر جو اس کے قوانین سے ہم آہنگ زندگی بسر کریں، سلامتی کی راہیں کھول دیتا ہے۔جس کا بتایا ہوا راستہ نوعِ انسانی کو اس کی منزل تک لے جاتا ہے

جسے دارالسلام، یعنی امن کا گھر کہا جاتا ہے۔لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴿۱۲۷﴾ (8:127)(ترجمہ)ان لوگوں کے لئے ان کے پروردگار کے نزدیک سلامتی وعافیت کا گھر ہےاور وہ ان کے اعمالِ حسنہ کی وجہ سے ان کا مددگار اور رفیق ہے۔ یہی وہ سلامتی کا گوشہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ دعوت دیتا ہےوَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾(10:25) ترجمہ: اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جو چاہتا ہے اسے کامیابی کی راہ پر لگا دیتا ہے اور اس تمام محنت وسعی کا مقصود ومنتہیٰ سلامتی کی جنت ہےاِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ﴿۴۶﴾ (15:45-46) ترجمہ: بلاشبہ متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے (اُنہیں کہا جائے گا) سلامتی کے ساتھ بہ اطمینان ان باغوں میں داخل ہو جاؤ۔

یہاں تک تو ہم نے عرض کیا ہے کہ قرآن کے بیانیہ کو تشدد اور دہشت گردی سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بیانیہ صرف ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

انسانوں نے جب سے آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنی شروع کی ہے تو انہوں نے خود سوچ سمجھ کر کوئی نظام وضع نہیں کیا تھا از خود زندگی گذارنے کے طریقے سامنے آتے چلے گئے۔ پہلے چھوٹے چھوٹے قبیلے بنے پھر آہستہ آہستہ قومیں بنتی چلی گئیں۔ پھر مختلف ممالک وجود پذیر ہوئے، اور ان میں قومی حکومتیں قائم ہوتی گئیں۔ آج نظامِ جمہوریت کا بہت چرچا ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ جمہوریت کوئی نظام یا کوئی آئیڈیالوجی نہیں ہے۔ نہ جمہوریت کے کوئی مقاصد ہیں اور نہ اس کی کوئی اساس ہے۔

> قرآنِ کریم کا موقف یہ ہے کہ ایسے مقامات پر صحیح فیصلہ کرنا جہاں ایک طرف دنیاوی نقطۂ نظر سے مفاد ہی مفاد نظر آرہے ہوں اور دوسری طرف دنیاوی نقطۂ نگاہ سے بظاہر نقصانات ہی نظر آرہے ہوں، تمہارے بس کی بات نہیں ہوتی

ہندوستان میں 75 سال سے جمہوریت ہے۔ لیکن جمہوریت کی وجہ سے ان کا کلچر، تمدن، اور رہن سہن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جو عیوب ان میں پہلے تھے وہ اب بھی ہیں۔ وہاں آج بھی کمیوں دلت کی جو حالت ہے اُسے دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ جمہوریت کا دعویٰ یہی ہے کہ اس میں سب لوگ برابر ہوتے ہیں۔ لیکن اس دعویٰ کی عملاً صورت یہ ہے کہ وہاں دلت کا درجہ جانوروں کے برابر ہے۔ عقلِ انسانی نے خود کوئی نظام وضع نہیں کیا۔ البتہ صرف کمیونزم کا نظام بہت غور وخوص کے بعد بنایا گیا۔ لیکن اس میں دو عیب تھے۔ ایک تو تشدد، اور حکومت کا جبر بہت تھا دوسرے اس نظام کی اساس نہیں تھی اور اس کا اعتراف مارکس نے خود بھی کیا تھا کہ کوئی ایک شخص ہزار روپے کما کر اپنا ضرورت سے زیادہ سرمایہ دوسرے کو کیوں دے۔ اس کی وجہ اسے سمجھ میں نہیں آئی اور اسی وجہ سے وہ نظام ناکام ہو گیا۔ سیکولر حکومتیں مقصود بالذات ہوتی ہیں۔ ان کے سامنے حکومت کے بلند مقاصد نہیں ہوتے۔ بلکہ اسلامی مملکت، قرآنی بیانیہ مقصود بالغیر ہوتا ہے اور وہی مقصود بالغیر اس بیانیہ کی اساس ہے

اور اس مملکت کے سامنے بلند مقاصد کا حصول ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم انسانوں کے وضع کردہ نظام ہائے حیات پر دو اعتراض وارد کرتا ہے جن کی وجہ سے وہ نظام رہنے کے قابل نہیں ہوتے اور قرآنِ کریم ان نظاموں میں زندگی بسر کرنا جرم قرار دیتا ہے (6:123)۔

قرآنِ کریم پہلا اعتراض یہ کرتا ہے کہ عقل انسانی خیر و شر کا تعین نہ آج کر سکتی ہے اور نہ آئندہ کبھی کر سکے گی۔ قرآنِ کریم کا یہ بہت بڑا چیلنج ہے جو آج تک اپنی جگہ جم کے کھڑا ہے۔ مغربی فلاسفرز اور دانشوروں کے نزدیک خیر و شر کا تعلق عقل سے نہیں ہے بلکہ وہ ان کے نزدیک خیر و شر کا تعین نہیں کر سکتی۔ اس طریقہ سے اُنہوں نے عقل کی شکست اور نارسائی کو تسلیم کر لیا۔ چونکہ جذبات ہر شخص کے انفرادی ہوتے ہیں اس لئے پھر خیر و شر کا تعین بھی انفرادی ہوگا۔

> اللہ کا دیا ہوا دین جس کو حضور ﷺ نے اس دنیا میں عملی شکل میں جاری کیا تو اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوگئی کیونکہ اس میں قوانین تو اللہ کے تھے اور جاری رسول اللہ کر رہے تھے تو اس کی اطاعت میں دونوں شامل ہو جاتے ہیں

مغربی مفکرین اخلاقیات بھی اضافی ہی مانتے ہیں۔ ارشاد عالی ہے وَعَسَىٰٓ اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـــًٔا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ ۚ وَعَسٰۤى اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـــًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّـكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ﴿۲۱۶﴾ (2:216) ترجمہ اور شاید کہ تم کو ایک چیز بُری لگے اور وہ تمہارے لئے اچھی ہو اور شاید کہ تم کو ایک چیز بھلی لگے اور وہ تمہارے لئے بُری ہو اور اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ یعنی یہ بات ضروری نہیں کہ جس چیز کو تم اپنے حق میں نافع یا مضر سمجھو اور وہ مفید ہو اور کسی چیز کو مفید سمجھو اور وہ تمہارے لئے نقصان دہ ہو۔ تمہارا نفع ونقصان خدا ہی خوب جانتا ہے تم اسے نہیں جانتے۔ قرآنِ کریم کا موقف یہ ہے کہ ایسے مقامات پر صحیح فیصلہ کرنا جہاں ایک طرف دنیاوی نقطۂ نظر سے مفاد ہی مفاد نظر آ رہے ہوں اور دوسری طرف دنیاوی نقطۂ نگاہ سے بظاہر نقصانات ہی نظر آ رہے ہوں، تمہارے بس کی بات نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہر شخص کی عقل اپنا ہی فائدہ سوچتی ہے۔ عقل خود بین غافل از بہود غیر۔ حقیقت تک نارسائی کی وجہ سے عقل انسانی درست نظام وضع نہیں کر سکتی۔

قرآنِ کریم کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر انسانوں کو قانون سازی کا حق دے دیا جائے تو یہ کبھی بھی صحیح قانون وضع نہیں کر سکتے۔ بلکہ باری تعالیٰ عزاسمہ نے فرمایا ہے وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ﴿۴۴﴾ (5:44) الظّٰلِمُوۡنَ﴿۴۵﴾ (5:45) الۡفٰسِقُوۡنَ﴿۴۷﴾ (5:47) ترجمہ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ (قانون) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ہی کافر ہیں، ظالم ہیں اور فاسق ہیں۔ ان آیات کی تفسیر کے ذیل میں، مولانا مودودی مرحوم نے بہت خوب تحریر فرمایا ''یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کئے ہیں ایک یہ کہ وہ کافر ہیں، دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں اور تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا

صاف صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے وہ دراصل ان تین جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اولاً اس کا یہ فعل حکمِ خداوندی سے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً اس کا یہ فعل عدل وانصاف کے خلاف ہے کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہوسکتا ہے وہ تو خدا نے دے دیا تھا اس لئے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو یہ ظلم ہوا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہوکر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی اور اطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر، ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہوا اور ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ (تفہیم القرآن جلد اوّل، صفحہ: 475)۔ قرآنِ کریم تو انسانوں کو قانون سازی کا اختیار ہی نہیں دیتا۔ ہمارے ہاں عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں صاحب نے یا فلاں پارٹی نے دستور کے تقدس کو پامال کر دیا۔ لیکن انسان کے بنائے ہوئے کسی قانون کا کوئی تقدس نہیں۔ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ (7:71) ترجمہ: اللہ نے اس کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔ تقدس صرف ان چیزوں کا ہوتا ہے جن کے ساتھ خدا کی سند موجود ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کو بھی یہی حکم تھا فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) اللہ نے جو نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلے کرو۔ تمام انبیاء کرام اپنے ساتھ وحی، کتابِ الٰہی، لاتے تھے اور اس کے مطابق فیصلے کرتے تھے (2:213)۔

> عقلِ انسانی مستقل اقدار کا تعین نہیں کرسکتی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسانیت وحی الٰہی کی محتاج ہوتی ہے

حضور ﷺ نے، اور آپ کے ساتھیوں نے حد درجہ محنت شاقہ کے بعد ایک نظام قائم کیا جس میں قرآنِ کریم کے احکامات جاری کئے۔ حضور ﷺ نے اپنے دور کے لئے مقامی حکام بھی جگہ بہ جگہ مقرر فرما دیئے تھے۔ ان مقامی حکام کو قرآنِ کریم نے اولوالامر کے نام سے موسوم کیا ہے اور جب دو پارٹیوں میں کوئی جھگڑا ہوتا تھا تو دونوں پارٹیاں حضور ﷺ کے سامنے فیصلہ کرانے مدینہ نہیں آتی تھیں بلکہ اپنے اپنے علاقہ کے حاکم سے اس جھگڑے کا فیصلہ کروالیتی تھیں۔ اس مقامی حاکم کی اطاعت حضور ﷺ کی ہی اطاعت گردانی جاتی تھی۔ اولواالامر کی اطاعت کی فرضیت سے چار نتائج برآمد ہوکر سامنے آئے۔

سب سے پہلے تو یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اولواالامر کی اطاعت سے اسلام مذہب کی سطح سے بلند ہوکر دین کے زمرہ میں داخل ہوگیا، اور ایک عملی نظام قائم ہوگیا۔ اور انسانیت پہلی مرتبہ ایک نظام کے تصور سے آگاہ ہوئی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ اب انسان کی حکومت دوسرے انسانوں پر حرام ہوگئی انسان براہِ راست قوانینِ خداوندی کے نیچے آگیا اور اصلی آزادی کی نعمت

پا گیا اس کا تیسرا نتیجہ یہ ہوا کہ حضورؐ کی ذاتی اطاعت کا تصور بھی ختم ہو گیا (3:79) اور اولوا الامر کی اطاعت اللہ و رسولؐ کی اطاعت قرار پا گئی، اور پرستش کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اللہ کا دیا ہوا دین جس کو حضور ﷺ نے اس دنیا میں عملی شکل میں جاری کیا تو اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہو گئی کیونکہ اس میں قوانین تو اللہ کے تھے اور جاری رسول اللہ کر رہے تھے تو اس کی اطاعت میں دونوں شامل ہو جاتے ہیں۔

اس نظام کی جو اساس محکم ہے اور جس مقصد کے لئے یہ نظام قائم کیا جاتا ہے اب وہ پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام کی یہ Unique خصوصیت ہے۔ زندگی The Life ہزاروں، لاکھوں سال میں آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہوئی حیوانیت کی سطح پر پہنچی اور جب حیوانیت کی سطح سے بلند ہوئی اور اس کو اگلی منزل میں داخل ہونا ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف سے ایک توانائی ایک صلاحیت عطا فرمائی جس کو قرآنِ کریم نے روح کے لفظ سے تعبیر کیا (15:29، 12 :38، 32:9)۔ یہ توانائی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب رہی تو یہ روحِ خداوندی کہلائی اور جب یہ توانائی نوعِ انسانی کو مل گئی تو قرآنِ کریم نے اس کو نفسِ انسانی کے نام سے تعبیر کیا۔ توانائی تو یہ ایک ہی ہے۔ لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ جب یہ توانائی انسانیت کو بہ حیثیت ایک نوع کے مجموعی طور پر ملتی ہے تو یہ نفسِ انسانی کے نام سے پکاری جاتی ہے اور یہ توانائی ہی انسانیت کو حیوانیت سے ممیز کرتی ہے اور صاحب ارادہ و اختیار بناتی ہے۔ عام طور پر لوگ انسان کو ''جسم اور روح'' کا مجموعہ تصور کرتے ہیں لیکن قرآنِ کریم انسان کو ''جسم اور نفس'' کا مرکب قرار دیتا ہے۔ قرآنِ کریم روحِ خداوندی کا تو قائل ہے لیکن روحِ انسانی کو تسلیم نہیں کرتا۔ جس وقت قرآنِ کریم نازل ہو رہا تھا، اس وقت ہر جگہ چاروں طرف روحِ انسانی کا ہی چرچا تھا۔ لیکن قرآنِ کریم کا یہ ایک اعجاز ہے کہ اس نے اس وقت نفسِ انسانی کا تصور دیا، جو بالکل منفرد اور انوکھی چیز تھی اور نفس کی نشوونما اور اس کی پرورش کو زندگی کا مقصد قرار دیا۔ سیکولر سٹیٹ میں رہنے والے اس نفسِ انسانی کے قائل نہیں ہوتے اس لئے ان کی زندگی حیوانیت کی سطح تک ہی بلند ہوتی ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12) ترجمہ اور وہ لوگ جو کافر ہیں دنیا کی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں اور جانوروں کی طرح کھاتے ہیں حالانکہ انسان کی زندگی کا مقصد ہی نفسِ انسانی یا ذاتِ انسانی کو نشوونما دینا ہے۔

> اس مملکت میں ایک شہری دوسرے شہری کی اس لئے پرورش کرتا ہے تاکہ اس کی اپنی ذات کی پرورش ہو

جب ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ چند انچ کا جسم اور نفس کا مرکب ہوتا ہے۔ نفس اور جسم دونوں کی پرورش کرنا اس کا فرض ہوتا ہے۔ بچہ کے جسم کی پرورش طبعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے، اچھی غذا کھانے سے اس کے جسم کی اچھی پرورش ہوتی ہے اور وہ تقریباً 5 یا 6 فٹ کا ہو جاتا ہے۔ انسانی نفس کی پرورش کے طریقے یہ ہیں کہ جو شخص مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرے گا اس کے نفس کی پرورش ہوگی اور دوسری بات یہ ہے صفاتِ خداوندی کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے سے

نفسِ انسانی نشوونما حاصل کرتی ہے۔

عقلِ انسانی مستقل اقدار کا تعین نہیں کر سکتی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسانیت وحی الٰہی کی محتاج ہوتی ہے۔(1) نفس کی ترقی کے لئے پہلی اور اہم ترین مستقل قدر یہ ہے اَلَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ﴿۱۸﴾ (92:18) جو شخص اپنا مال دوسروں پر خرچ کرتا ہے، اس کے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے۔ قرآنی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے وَمَنۡ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفۡسِہٖ ؕ (35:18)(2) جو شخص دوسروں کی پرورش کرتا ہے اس سے اس کے اپنی نفس کی پرورش ہوتی ہے۔ (3) چونکہ انسانی ذات ہر انسانی بچہ کو یکساں طور پر ملتی ہے۔ اس لئے ہر انسان صرف انسان ہونے کی جہت سے واجب الاحترام ہے وَلَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70) ترجمہ: ہم نے تمام انسانوں کو واجب التکریم بنایا ہے۔ لہٰذا احترام انسانیت ایک مستقل قدر ہے۔ اس سے ذات پات، حسب نسب، رنگ نسل کے تمام امتیازات بھی دفن ہو گئے۔(4) عدل ایک مستقل قدر ہے وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا ۟ ہُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ۫ (5:8) ترجمہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم عدل نہ کرو، بہرحال عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔(5) کسی شخص کی ذمہ داری دوسرا شخص نہیں اٹھائے گا وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ؕ (39:7) ترجمہ، کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا (6) کوئی کسی کا غلام یا محکوم نہیں ہو سکتا۔ وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ (2:219) تم سے پوچھتے ہیں کہ کس قدر دوسروں کے لئے خرچ کریں کہہ دو جو تمہاری ضرورت سے زائد ہے۔(7) جس شخص کے لئے نکاح کی صورت پیدا نہ ہو وہ ضبطِ نفس سے کام لے اور اپنی عصمت کی حفاظت کرے وَلۡیَسۡتَعۡفِفِ الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ نِکَاحًا حَتّٰی یُغۡنِیَہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ (24:33)(8) پوری نوعِ انسانی ایک اُمتِ واحدہ ہے (10:19)

(9) وَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ (13:17) ترجمہ زمین میں ہمیشگی اور دوام اسی کو حاصل ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہے۔

(10) لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾ (53:39) ترجمہ کسی انسان کو سوائے اس کی محنت کے اور کچھ نہیں ملتا۔

ہم نے یہ دس مستقل اقدار تحریر کی ہیں ان اقدر پر عمل کرنے سے انسانی ذات میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ ذات کے استحکام کی خاطر اسلامی مملکت کے شہری ان اقدار پر عمل کرتے ہیں لیکن اس کا By-Product یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ بہترین سے بہترین ہوتا جاتا ہے۔ اسلامی مملکت کا شہری کسی کا حرام مال نہیں کھاتا تا کہ اس کی ذات پر بُرا اثر نہ ہو۔ وہ اس لئے کوئی جرم نہیں کرتا کہ جرم کے ارتکاب سے اس کا نفس مضمحل ہوتا ہے۔ اس طرح اسلامی مملکت میں جرائم کم ہو جائیں گے، کوئی حرام مال نہیں کھائے گا۔ اس مملکت میں ایک شہری دوسرے شہری کی اس لئے پرورش کرتا ہے تا کہ اس کی اپنی ذات کی پرورش ہو۔

ہر وہ کام جو نفس کی پرورش کے لئے کیا جائے گا، اس کا اسی قدر فائدہ سٹیٹ کا ہوگا اور اس کا استحکام بڑھتا جائے گا اس طرح اسلامی مملکت تزکیۂ نفس کے ذریعے بنتی ہے اور اس کے قیام کا مقصد تزکیۂ نفس بن جاتا ہے۔ اس ریاست سے تزکیۂ نفس کے بلند مقاصد حاصل ہوتے ہیں اور زندگی نئی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے۔

نفس انسانی کے تزکیہ کے لئے مستقل اقدار پر عمل کرنے کے علاوہ دوسرا ذریعہ ہم نے تحریر کیا تھا کہ صفاتِ خداوندی کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ منعکس کرنے سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے۔ ہم اب اس کی وضاحت عرض کرتے ہیں۔

اس عالم کو پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کا مظاہرہ ہو۔ کوئی مذہب یا کوئی انسان جو خدا کو فاعل مختار مانتا ہے انجام کار اس کے سوا دوسری غرض نہیں بتا سکتا۔ تخلیقِ عالم کی غرض ہی یہ ہے کہ اس کی صفات پر عمل ہو۔ اور ان صفات کا ظہور ہو۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾ (65:12) یعنی زمین و آسمان کی تخلیق اور ان کے کل نظم و نسق سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی قدرت کاملہ اور علم محیط کا علم لوگوں کو حاصل ہو۔ تخلیقِ عالم کی یہ غرض جب ہی پوری ہوسکتی ہے کہ مخلوقات میں اس کی ہر قسم کی صفات و کمالات کا اظہار ہو اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ اس عالم میں مطیع وفادار اور باغی اور مجرم ہر قسم کی مخلوق موجود ہو اس نے اس دنیا کا سارا نظام ہی ایسا رکھا ہے کہ بندوں کو خیر و شر کے اکتساب میں مجبور نہ بنایا جائے۔ اگر صرف خیر کی قدرت پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیقِ عالم کی حکمت و مصلحت پوری نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جاتیں کہ ان کے اظہار کے لئے کوئی موقع نہ رہتا۔ مثلاً عفو، منتقم الشدید قائم بالقسط کا مظاہرہ نہ ہوسکتا۔

> اسلامی ریاست کی اساس صفاتِ خداوندی پر ہوتی ہے۔ یہی مستقل اقدار ہوتی ہیں اور یہی حقوقِ انسانی ہوتے ہیں۔ ہر اسلامی ریاست کو، عادل، رازق، حکیم، علیم، خبیر، قوی، عزیز، رحیم وغیرہ ہونا چاہئے

صفاتِ باری تعالیٰ عزاسمہٗ کا تقاضہ ہے کہ ان پر عمل کیا جائے اور ان کا اس دنیا میں جگہ بہ جگہ، وقت بہ وقت مظاہرہ ہونا ہے۔ ہر شخص ان کو اپنے اندر پیدا کرے۔ جتنی جتنی صفات کوئی شخص اپنے میں منعکس کرتا چلا جائے گا، اسی قدر قربِ خداوندی اس کو حاصل ہوتا رہے گا۔ اسلامی مملکت کی اساس بھی یہی صفاتِ خداوندی ہوتی ہے۔

مستقل اقدار پر عمل کرنے اور صفاتِ خداوندی کو اپنے میں منعکس کرنے سے نفسِ انسانی کی نشوونما ہوتی ہے۔ ہم نے اوپر اس نظام کے حوالہ دیا ہے جو حضور ﷺ نے مدینہ میں قائم فرمایا تھا۔ اس نظام میں مستقل اقدار اور صفاتِ خداوندی پر عمل کیا جاتا تھا۔ مستقل اقدار پر عمل کرنے اور صفاتِ خداوندی کو ظہور میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ سیکولر سٹیٹ میں نہ مستقل اقدار پر عمل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس میں صفاتِ خداوندی ظہور میں لائی جا سکتی ہیں۔

وہ نظام مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ وہ نظام اس لئے قائم کیا جاتا ہے کہ اس میں زندگی بسر کرنے سے نفس انسانی کی نشوونما ہوتی ہے۔ زندگی ناقابل تقسیم ہے یہ نہ طولاً تقسیم کی جاسکتی ہے نہ عرضاً۔

اسلامی مملکت میں زندگی بحیثیت مجموعی ترقی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات مکمل ترین اور Perfect ذات ہے۔ جو لوگ صفاتِ خداوندی کو اپنے میں منعکس کرتے ہیں وہ بہترین سیرت کے حامل ہوجاتے ہیں۔ عقل انسانی خیر وشر میں تمیز نہیں کرسکتی۔ اس کے تقابل میں مستقل اقدار جو وحی کے ذریعے ملی ہیں۔ ان دونوں کا تقابل بھی نہیں ہوسکتا۔ جس مملکت کے شہری، صفاتِ خداوندی کو اپنے میں منعکس کرتے ہیں، اور مستقل اقدار پر عمل کرتے ہیں، ان سے زیادہ پختہ سیرت اور کوئی نہیں ہوسکتا اور چونکہ اس ریاست کی اساس بھی ان ہی دونوں چیزوں پر ہوتی ہے، اس لئے اس ریاست سے بہتر اور کوئی ریاست نہیں ہوسکتی۔ صفاتِ خداوندی کے مطابق عمل کرنے سے انسانیت کی خدمت ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم اس مضمون میں لکھتے چلے آرہے ہیں۔ اس ریاست کے شہریوں کی زندگی کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم آپ کے سامنے Quranic Narrative کو Sum up کرتے ہیں۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ حضور ﷺ نے قرآنی بیانیہ کی کن چمکدار الفاظ میں تعریف کی ہے۔ ہمارا یہ مضمون طلوع اسلام نومبر 2014ء میں صفحہ نمبر 30 پر طبع ہوا تھا۔

''البتہ اب ہم ان صفاتِ عالیہ کو ریاست سے Relate کرتے ہیں کہ ان صفاتِ عالیہ کا ریاست سے کیا تعلق ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست کی اساس صفاتِ خداوندی پر ہوتی ہے۔ یہی مستقل اقدار ہوتی ہیں اور یہی حقوقِ انسانی ہوتے ہیں۔ ہر اسلامی ریاست کو، عادل، رازق، حکیم، علیم، خبیر، قوی، عزیز، رحیم وغیرہ ہونا چاہئے۔ میری ذات کا بھی یہ تقاضہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے، عدل، حکمت، صبر، سماعت، بصارت وغیرہ سے کام لوں میں جب ریاست کے اس فیصلہ کی اطاعت کرتا ہوں جو عدل پر مبنی ہے تو میری یہ اطاعت اس ریاست کی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ یہ میری ذات کے ایک تقاضہ کی اطاعت اور اس تقاضہ کو پورا کرنا ہوگا جس طرح پانی پینے سے میں کسی کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ اپنی ذات کا ایک تقاضہ پورا کرتا ہوں۔

اسی طرح جب اسلامی ریاست اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کے تقاضہ کو پورا کرتی ہے تو اس کی اطاعت میری اپنی ذات کی اطاعت ہوتی ہے اور اپنی ذات کا ایک تقاضہ پورا کرنا ہوتا ہے۔ ہم سب اللہ تعالیٰ کی صفات پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کو رازق، عادل، رحیم، کریم، رب مانتے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ عقیدہ صرف مجرد صفات (Abstract) پر ہے۔ لیکن جب اسلامی ریاست اللہ تعالیٰ کی صفات کو روبرعمل لاتی ہے اور رزق فراہم کرتی ہے، سب کی ربوبیت کرتی ہے۔ سب کے ساتھ عدل کرتی ہے۔ تو اس طرح صفاتِ خداوندی ایک محسوس، مرئی ٹھوس شکل میں سامنے آجاتی ہے اور تمثیلاً اور تشبیہاً

اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی صفات عالیہ وکمالیہ کے ساتھ زمین میں آ کر نورفشاں ہوجاتا ہے۔ اسلامی مملکت میں اس کی اطاعت کرنے کی وجہ سے انسانی ذات کی نشوونما ازخود ہوتی چلی جاتی ہے اور اس طرح انسانی ذات اور اسلامی معاشرہ کا تزکیہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ جس طرح طبعی قوانین کا علم حاصل کرنے سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح وحی خداوندی کا علم، اور مستقل اقدار پر عمل کرنے سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ (11:66) بیشک تیرا رب وہی ہے قوت والا اور غلبہ والا۔ جب اس صفتِ خداوندی کو منعکس کیا جائے گا تو لازم ہے کہ ریاست قوی اور غلبہ والی ہوگی۔

یہی وہ نظام ہے جو ظل اللہ فی الارض ہوتا ہے۔ اس نظام کی تعریف کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا تھا: لقد ترکت علی مثل البیضاء لیلھا و نھارھا سواء۔ میں تم میں وہ ملت بیضا چھوڑے جارہا ہوں جس کی رات اس کے دن کی مانند روشن ہوتی ہے۔ لیکن افسوس کہ آج اس بدنصیب قوم کا دن بھی رات کی طرح تاریک ہے۔ اگرچہ یہ مضمون طویل ہوگیا ہے اور علماء کرام کے بیانیہ کی گنجائش نہیں رہی جو وہ پیش کرسکتے ہیں۔ لیکن اس کے بغیر مضمون بھی پورا نہیں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہم مختصر ترین الفاظ میں علماء کرام کے بیانیہ کے متعلق چند گذارشات پیشِ خدمت عالی کرتے ہیں۔

جہاں تک علماء کرام کا بیانیہ کا تعلق ہے اس پر اس شعر سے بہتر اور کوئی تبصرہ نہیں ہوسکتا۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج　　تا ثریا می رود دیوار کج

مفہوم: جب معمار نے دیوار کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی ہے دیوار تو ثریا کے ستاروں تک ٹیڑھی ہی اٹھے گی۔

آیۂ کریمہ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (15:29) اور ہم نے اس میں اپنی طرف سے روح پھونک دی۔ ہم نے اسی مضمون میں عرض کیا ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں جب روح کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد روحِ خداوندی ہوتی ہے اور جب اس کی نسبت انسان کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد نفسِ انسانی ہوتی ہے۔ کیونکہ قرآنِ کریم روحِ خداوندی کا تو قائل ہے، لیکن وہ روحِ انسانی کو تسلیم نہیں کرتا، ہمارے علماء کرام سے یہ تسامح ہوا ہے کہ وہ اس باریک فرق کو Detect نہیں کرسکے اور اُنہوں نے نفسِ انسانی کا انکار کیا، اور روح انسانی کو انسانیت کی اساس قرار دیا۔ مغربی مفکرین، سیکولر حکومتوں کے داعین، اور ہمارے علماء کرام نفس انسانی کے منکر ہیں۔

اس معاملہ میں مغربی مفکرین اور ہمارے علماء کرام ایک Page پر ہیں لیکن چونکہ قرآنِ کریم نفس انسانی کا قائل ہے اس لئے اس نے نفس انسانی کی نشوونما کے طریقے بھی خود تحریر کئے ہیں جو ہم نے اس مضمون میں تحریر کردیئے ہیں۔ لیکن چونکہ قرآن کریم روحِ انسانی کا قائل ہی نہیں ہے اس لئے اس نے روح انسانی کی نشوونما کے طریقے بھی نہیں بتائے۔ قرآنِ کریم میں تو روحانیت کا لفظ تک نہیں آیا۔

لیکن ہمارے علماء کرام کے نزدیک زندگی کا مقصد ہی روحانیت حاصل کرنا ہے۔ روحانیت کے حصول کے لئے ہمارے علماء کرام نے جوطریقے اختیار کئے وہ قوم کوتباہ وبرباد کرنے کے لئے کافی ہیں۔

صوفیائے کرام کے زیر اثر ہمارے علماء کرام وحدت الوجود کے قائل ہوئے ہیں۔ ہمارے سامنے فارسی زبان کے شعراء، مولانا روم سمیت، اور اردو زبان کے شعراء غالب سمیت، سب وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ وحدت الوجود کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس عالم محسوس کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ وحدت الوجود کے معنی یہ ہیں کہ یہ کائنات جو ہمیں اس طرح محسوس، Concrete شکل میں دکھائی دے رہی ہے اپنا وجود نہیں رکھتی۔ اس عقیدہ کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کا کائنات کے متعلق منفیانہ اندازِ نگاہ بن جاتا ہے۔ غالب نے کہا۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ   عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہمارے علماء کا یہ عقیدہ بالکل قرآن کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ کائنات کا وجود بالحق ہے (29:44)، کائنات کے متعلق جو علم حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، اس کو علماء قابلِ اعتماد ہی نہیں سمجھتے۔ ان کے ہاں علم کے ذرائع باطنی ہیں اور وہ صرف باطنی علم کو ہی علم سمجھتے ہیں لیکن یہ نظریہ بھی قرآن کے خلاف ہے۔

پھر ان ہی علماء نے مادہ کو قابل نفرت اور روح کے مقابل لا کھڑا کیا۔ ان کے نزدیک جس قدر مادہ سے نفرت ہوگی۔ اسی قدر روحانیت میں اضافہ ہوگا۔ ان کے نزدیک روحانیت پرستش کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور پرستش انفرادی فعل ہے۔

اس کے لئے کسی معاشرہ یا ریاست کی ضرورت ہی نہیں۔ روحانیت میں ترقی اور وظائف، بڑے بڑے چلوں سے ہوتی ہے۔ یہ تمام چیزیں پہاڑوں، جنگلوں، صحراؤں، گوشوں، کونوں، زاویوں میں ہوتی ہیں ان میں معاشرہ کی ضرورت نہیں۔ روحانیت انفرادیت کی داعی اور اجتماعیت کی دشمن ہے۔ معمولی سا غور کرنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ علماء کرام کے پاس کوئی بیانیہ ہو ہی نہیں سکتا وہ بیانیہ کے قائل ہی نہیں۔ ان کے ہاں نظام کا تصور ہی نہیں۔ نہ اس کی ضرورت ہے۔ ہمارے علماء کرام کے عقائد اُنہیں اقامتِ دین کی اجازت ہی نہیں دیتے۔

ہمیں افسوس ہے کہ مضمون کی طوالت کی وجہ سے ہم اصل نکتہ کہ ہمارے علماء کرام نظام کے قائل نہیں ہیں، اس کے متعلق کچھ زیادہ نہ تحریر کر سکے، حالانکہ اصل نکتہ ہی وہ تھا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کیا شوہر اپنی بیوی کو بدنی سزا دے سکتا ہے؟
(اضۡرِبُوۡھُنَّ کی تفہیم)

میرا مقالہ ''بعنوان قرآنی تعلیمات کے مطابق مرد عورت سے افضل اور نہ ہی عورت مرد سے کمتر ہے'' ستمبر سے دسمبر کے طلوع اسلام کے شمارے میں چار اقساط میں شائع ہوا ہے۔ اِسے بُہت سراہا گیا اور اب قارئین کی خواہش کی تکمیل میں اسے کِتابچہ کی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔ اِس مقالہ پر ادارہ سے وابستہ دو مُعز زاصحاب کی طرف سے، جِن میں ہم سب کے اُستادِ گرامی بھی شامل ہیں، عورت کو مار پیٹ کے عنوان کے متعلق دو خطوط میں وضاحت مانگی گئی ہے۔ لہٰذا اُن کے مختصر اہم نکات بیان کرتے ہوئے اپنی سمجھ کے متعلق وضاحت کی جارہی ہے۔

ایک خط میں ہمارے اُستادِ گرامی مُحترم شیخ اللہ دِتہ ایڈووکیٹ نے بھی میرے مقالہ پر اسی نُکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> قانون میں امتیاز رکھنے کی روش ایک مہذب معاشرہ میں روا رکھنا تو کُجا یہ تو سوچ میں بھی نہیں لائی جاتی۔ لہٰذا اگر بیوی کی نام نہاد اصلاح کے لئے پھینٹی شوہر لگا سکتا ہے تو یہی اختیار شوہر کی اصلاح کے لئے بیوی کو بِلا امتیاز خود بخود منتقل ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں لگتا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں شوہروں کو پٹنے کے علاوہ دیگر فرائض ادا کرنے کی فُرصت ہی نہیں مِلا کرے گی

''ڈاکٹر انعام الحق صاحب کے مضمون کے کچھ حصے معمولی وضاحت طلب ہیں لیکن انہیں وجہ تبصرہ نہیں بنایا جاسکتا۔ ان کا مضمون عالمی سطح پر پذیرائی حاصل کرے گا۔

جیسا کہ آپ کے پہلے بھی علم میں ہے مَیں عورت کی بدنی سزا کے خلاف ہوں اور اضۡرِبُوۡھُنَّ کا ترجمہ درست خیال نہیں کرتا۔ (اِس ضِمن میں اُن کے موقف سے اختِلاف تو کیا جاسکتا ہے، لیکن اُسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا) بدنی سزائیں مرد و عورت کے لئے دوسرے جرائم میں ہیں جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے بھی مردوں کی سزا بدنی (16:4) کا حوالہ دیا ہے کہ۔

وَالَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ فَاٰذُوۡھُمَا ۚ فَاِنۡ تَابَا وَاَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡھُمَا ؕ (16:4)

اور اگر دو مرد اِس قسم کی بے حیائی کے مُرتکب ہوں تو انہیں مناسب بدنی سزا دو۔ لیکن اگر وہ اپنے کئے پر نادم ہو کر اِس

سے باز آ جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں، تو اُن سے درگذر کرو۔ (جبکہ عورت کے لئے فحاشی کے ضمن میں بھی بدنی سزا مقرر کی گئی ہے۔)

اِسی طرح سوال پیدا ہوتا ہے کہ نُشُوزَھُن میں بدنی سزا صرف عورت کے لئے کیوں؟ مرد کے ''نشوز یا اعراض'' (4:128) میں مرد کو بدنی سزا تجویز نہیں ہوئی۔ وہاں صرف صلح کے لئے کہا گیا ہے یا عدم صلح میں ''جدائی'' تجویز ہے۔''

اسی تناظر میں چوہدری محمد لطیف صاحب سے بھی خط و کتابت ہوئی جن کے متعلقہ نکات درج کئے جا رہے ہیں۔

''پہلی بات یہ کہ میری نظر میں سورۃ النساء کی آیت چونتیس کا تعلق مرد عورت سے نہیں بلکہ میاں بیوی سے ہے اور دوسری یہ کہ ہنستے بستے گھر کو اجڑنے اور بچوں کو تباہی سے بچانے کے لیے جہاں تمام حربے ناکام ہو جائیں وہاں مارنے کی بغرض اصلاح اجازت دی گئی ہے۔ اسے فرض قرار نہیں دیا گیا۔

کسی دوسرے فرد کو مارنا بظاہر ناروا ہے۔ لیکن مارنے کی بھی کئی اقسام ہیں۔ مارا ایذا رسانی کے لئے بھی جاتا ہے اور اصلاح کے لئے بھی۔ ضرورت پڑے تو استاد اپنے شاگردوں کو اور مائیں اپنے بچوں کو بغرض اصلاح چھینٹی لگاتی ہیں۔ اسی طرح جب دھلائی کے سارے طریقے ناکام ہو جاتے ہیں تو داغ دھبے دور کرنے کے لئے دھوبی کپڑوں کو چھینٹی لگاتا ہے۔ مارنا اسے بھی کہتے ہیں لیکن اس پر نہ مار کھانے والے کی تذلیل ہوتی ہے نہ کسی دوسرے کو اعتراض ہوتا ہے۔

گھر میں بیوی اگر سرکشی اختیار کرتی ہے (جس کے امکانات کا خالقِ کائنات کو علم تھا) تو اصلاح احوال کے لئے پہلے پند و نصائح، پھر ہمبستری سے اجتناب اور آخر میں ضروری سمجھا گیا کہ اگر تھوڑی بہت چھینٹی لگانے سے گھر بچ سکتا ہو تو اسے بھی آزما لیا جائے کیونکہ اس کے بعد ہمیشہ کی جدائی اور عمر بھر کے پچھتاوے کے سوا کوئی چارا باقی نہیں رہتا۔ طلاق کی راہ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے بہت سی پابندیاں لگائی ہیں وہاں اس سے بچنے کے لئے ممکنہ علاج بھی تجویز فرمائے ہیں جن میں بغرض اصلاح (نہ کہ بطور سزا) تھوڑی بہت چھینٹی لگانا آخری علاج ہے۔ عربی میں جانتا نہیں اور اردو یا انگریزی میں چھینٹی سے بہتر لفظ میرے علم میں ہے نہیں۔ یہی لفظ ماؤں سے سنتے آئے ہیں باز آ جاؤ ورنہ ایسی چھینٹی لگاؤں گی کہ تمہیں نانی یاد آ جائیگی۔

میرے محترم استاد ڈاکٹر انعام الحق صاحب مارنے کو ناجائز نہیں سمجھتے مگر یہ حق وہ خاوند کی بجائے حاکمِ وقت یا عدالت کو دیتے ہیں۔ لگتا ہے گھر کو تباہی سے بچانے کے لیے خاوند اصلاحِ احوال کے لیے بیوی کو ایک آدھ چپت رسید کر دے تو یہ ان کے نزدیک بیوی کی تذلیل ہے لیکن حکومت کا جلاد تارا مسیح اس کے ننگے بدن پر کوڑے برسائے تو اس سے نہ خاوند بیوی کے مابین محبت و مودت مجروح ہوگی نہ ہی طلاق کی نوبت آئیگی۔''

اِس خط کا میری طرف سے جواب دیا گیا کہ:

میرے پیارے بھائی جانتے ہیں کہ قانون میں امتیاز رکھنے کی روش ایک مہذب معاشرہ میں روا رکھنا تو کُجا یہ تو سوچ میں بھی نہیں لائی جاتی۔ لہذا اگر بیوی کی نام نہاد اصلاح کے لئے چھینٹی شوہر لگا سکتا ہے تو یہی اختیار شوہر کی اصلاح کے لئے

بیوی کو بلا امتیاز خود بخود منتقل ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں لگتا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں شوہروں کو پیٹنے کے علاوہ دیگر فرائض ادا کرنے کی فُرصت ہی نہیں مِلا کرے گی۔ اسلامی حکومت کی اطاعت دونوں مرد و زن پر ماتھے پر بغیر شکن لائے اور بلا تر دد دِل کی کامل رضا مندی سے کرنا مومنین کا بنیادی فریضہ ہے، اسے ننگے بدن بیوی کی زنا کاری کی مترادف پٹائی کی سزا اور وہ بھی تارا مسیح کے ہاتھوں سے تشبیہ دینا جائز نہ ہوگا۔

ایسی سزا کا تصور قرآنی ذہن میں تو چوہدری صاحب پیدا ہی نہیں ہونے دینا چاہیے۔ میرے خیال میں نکاح کے معنی ہی معاہدہ ہوتا ہے جس میں دو پارٹنر بمعنی زوج بغیر کسی اکراہ کے اور دِل کی پوری رضا مندی سے داخل ہوتے ہیں تا کہ اپنے نئے گھر کو جنت کا نمونہ بنا سکیں۔''

اس خط کے جواب میں چوہدری صاحب نے اُستادِ گرامی کے نُکتہ کی وضاحت کی کہ:

'' آپ نے فرمایا منطق کی رو سے کسی کجروی کی جو سزا بیوی کے لئے ہے وہی سزا خاوند کے لئے بھی ہوگی۔ آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہونگے میں تو منطق نہیں جانتا مگر قرآنِ کریم میں ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ النساء کی آیت 34 میں عورت کے لئے نشوز کی سزا مختلف ہے اور آیت 128 میں خاوند کے اسی جرم کی سزا کچھ اور ہے۔''

قبل اس کے کہ ہم ایک ہی عمل کی سزا میں مرد کے لئے نرم اور عورت کیلئے سخت سزا کا جائزہ لیں، محترم اللہ دِتہ صاحب ایڈوکیٹ نے نشوز کے معانی بھی اپنے خط میں یوں درج کئے ہیں کہ

1۔ میاں بیوی میں سے ایک کا مخالفت پر اتر آنا۔
2۔ نافرمانی کرنے لگنا۔
3۔ جھگڑنا۔
4۔ بدسلوکی کرنا۔
5۔ ایک دوسرے کے خلاف یا سامنے کھڑے ہو جانا۔
6۔ متنفر ہو جانا اور
7۔ بلند ہونے اور بڑا ہونے کا اظہار کرنا۔

اِن سبھی معانی کی رو سے انسان کا اپنے فرائضِ منصبی کے خلاف ہونے کے معنی کی دلالت ہوتی ہے۔ اِسی لئے راغب نے کسی چیز کا اپنی جگہ (فرائضِ منصبی) سے ہٹ جانا بتائے ہیں۔

یہاں پہلے پانچ معانی میں یہ اضافی اور مخصوص معانی میں زیرِ بحث شوہر اور بیوی کے تعلقات کے موضوع میں استعمال ہوتا ہے۔

اِس کے برعکس منطقی طور پر دیکھا جائے تو نشوز کے اِن درجِ بالا سات معانی میں چھٹا اور ساتواں معانی مخصوص اور اضافی پوزیشن میں صِرف شوہر اور بیوی کے تعلقات پر شامل نہیں، بلکہ یہ مُطلق اور سبھی مرد و زن پر وارد ہونے کا تاثر دیتے

ہیں اور اِن سے کسی شوہر اور بیوی وغیرہ کے ساتھ تقابل نہیں کیا جانا چاہیے۔

اب ہم سوال کے اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں، جس کی نشاندہی اُستادِ گرامی شیخ اللہ دتہ صاحب اور چوہدری صاحب دونوں نے کی ہے کہ سورہ النساء کی آیت 34 میں عورت کے لئے نشوز کی سزا مختلف ہے اور آیت 128 میں خاوند کے اسی جرم کی سزا کچھ اور ہے۔

اِس کی نشاندہی کرتے ہوئے چودہری صاحب ہمارے اِس موقف کو جُھٹلا رہے ہیں کہ قانون اور خصوصی طور پر قرآنی قوانین بِلا امتیاز ہوتے ہیں جس میں میاں بیوی کے ایک ہی قِسم کے نشوز کے وقوع پذیر ہونے پر غیر امتیازی سزائیں نہیں ملتی ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ زیادہ گہرائی میں جاتے تو وہ جان لیتے کہ آیت 34 میں نشوز میاں بیوی کا نجی معاملہ نہیں بلکہ مُطلق طور پر سبھی عورتوں پر اطلاقی پوزیشن رکھتا ہے اور اللہ کے مقرر کردہ فرائضِ منصبی سے نشوز کی صورت میں سزا کا حقدار ہے۔

اِس کے برعکس دوسری درج آیت کا تعلق اضافی اور مخصوص طور پر میاں بیوی کا نجی معاملہ ہے، لہذا اجتماعی نہ ہونے کی وجہ سے سزا کا حقدار نہیں گردانا جا سکتا، بلکہ ایسی صورت میں معاشرہ سے کہا گیا ہے کہ وہ اُن کے درمیان صُلح کرانے کی ہر ممکن کاوشیں کریں اور ناکام ہونے کی صورت میں علیحدگی کا اعلان کر دیں۔ لہٰذا یہاں مناسب ہوگا کہ بیان کی گئی دونوں آیات کا تجزیہ کر کے بات کی مزید وضاحت کی جائے۔

پہلی آیت سورہ النساء کی 34 جس کا حوالہ دیا گیا ہے، اُس کی تفصیل میں ہے کہ

34۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ط فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ط وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ

مرد اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے، عورتوں کو سامان رزق مہیّا کرنے کے ذمّہ دار ہیں۔ خدا نے مرد اور عورت کو بعض امور میں ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی ہے، (مردوں کی فضیلت یہ ہے کہ عورت جسمانی بناوٹ اور مختلف جسمانی فریضوں کے اعتبار سے مسلسل کام نہیں کر سکتی، اس لئے مردوں کی ذمّہ داری ہے کہ وہ اکتساب رزق کریں)، اور یوں مردوں کے اکتساب رزق سے عورتوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

پس اس طرح ان (عورتوں) کی صلاحیّتیں نشوونما پاتی ہیں، اور وہ اپنی صلاحیّتوں کو اسی مقصد کے حصول میں صرف کریں گی، جس کے لئے وہ مخصوص صلاحیّتیں دی گئی ہیں۔ (اس طرح جب عورتوں کو سامان رزق کے اکتساب سے فرصت مل گئی) تو وہ اس چیز کی حفاظت کر سکیں گی (جنین کی) جو پوشیدہ طور پر ان کے سپرد کی گئی ہے، اور اگر (بیوی نہیں) عورتوں کی طرف سے تقسیم کار سے سرکشی کا اندیشہ لاحق ہو جائے، تو (1) معاشرہ انہیں سمجھائے، (2) باز نہ آئیں تو ان کے شوہروں یا سرپرستوں سے معاشرہ کہے کہ ان کو خواب گاہوں میں محصور کر دو، اس کے باوجود سرکشی نہ چھوڑیں تو (3) معاشرے کی عدالت انہیں بدنی سزا دے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ کا مفہوم:

یہاں میاں بیوی کی بات نہیں ہورہی ہے۔ بات الرجال اور النسآء (4:34) کی ہو رہی ہے اور معاشرے سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں کسی ایک عورت کی طرف سے یا عورتوں کی طرف سے اندیشہ ہو کہ وہ اپنے فرائض منصبی کے ساتھ بچوں کی نگہداشت نہیں کر رہی ہیں، جس کی وجہ سے یا ان کے منفی رویے کی وجہ سے گھر یا معاشرہ کا ماحول صحت مند نہیں رہا تو **فَعِظُوْهُنَّ** (4:34) قرآنی معاشرے کی حکومت انہیں سمجھائے گی، نصیحت کرے گی کہ باز آ جاؤ۔ یہ خاوند کو نہیں معاشرے کو یعنی حکومت کو حکم دیا جار ہا ہے۔

وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ (4:34) کا مفہوم:

اگر کچھ عورتیں یا (کوئی عورت) باز نہیں آ رہی ہیں حکومت خاوندوں سے کہے کہ وہ انہیں اپنی خوابگاہوں سے الگ کردیں اور ان سے عارضی طور پر جنسی تعلق ختم کرلیں۔ یہ کچھ محبوس کردینے والی بات ہے، جس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے کہ اگر تمہیں خطرہ ہو کہ کوئی بے حیائی کی بات ہو جائے گی، تو انہیں ان کے گھروں میں روک لو۔

وَاضْرِبُوْهُن کا مفہوم:

اگر عورت خوابگاہ الگ کرنے سے بھی اپنی ان حرکتوں سے باز نہ آئے تو پھر عدالت یا حکومت عورت کو بدنی سزا دے گی، تا کہ یہ پھر سے فرائض کی ادائیگی اور گھروں کے ماحول کو خوشگوار بنانے پر راضی ہو جائیں۔ آگے ہے فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (4:34) ''جب وہ قانون کی اطاعت کرنے پر رضامند ہو جائیں، تو ان پر خواہ مخواہ ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ یہاں خاوند کا تو کہیں ذکر ہی نہیں آ رہا ہے۔ اس سے آگے ہے اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا (4:34) ''یاد رکھو! خدا کے قوانین غالب ہیں، بالا دست ہیں''، کوئی سرکش یہ نہ سمجھ لے کہ انہیں کوئی قابو نہیں کر سکتا۔

> یہاں میاں بیوی کی بات نہیں ہورہی ہے۔ بات الرجال اور النسآء (4:34) کی ہو رہی ہے اور معاشرے سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں کسی ایک عورت کی طرف سے یا عورتوں کی طرف سے اندیشہ ہو کہ وہ اپنے فرائض منصبی کے ساتھ بچوں کی نگہداشت نہیں کر رہی ہیں، جس کی وجہ سے یا ان کے منفی رویے کی وجہ سے گھر یا معاشرہ کا ماحول صحت مند نہیں رہا تو **فَعِظُوْهُنَّ** (4:34) قرآنی معاشرے کی حکومت انہیں سمجھائے گی، نصیحت کرے گی کہ باز آ جاؤ۔ یہ خاوند کو نہیں معاشرے کو یعنی حکومت کو حکم دیا جار ہا ہے

ہماری بصیرت کے مطابق، اس آیت کے مفہوم کے اعتبار سے یہ شکل ہے۔ معانی کے لئے جس کا جی چاہے لغتِ ''لسانِ عربی'' کی کتاب اٹھا کر دیکھ لے۔ ہم نے لغت ''لسان عربی'' اور قرآن کے انداز تصریف آیات کو ترجیح دی ہے اور ساتھ ہی اس کا بھی خیال رکھا ہے کہ جو مفہوم لیا جائے، وہ قرآن کی مجموعی تعلیم اور دیگر آیات کے مطابق ہو۔ قرآن تو اپنے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت ہی یہ دیتا ہے کہ اس کی تعلیم میں کوئی تضاد نہیں

ہے۔ایسا ہر گز نہیں ہے کہ قرآن ایک مقام پہ تو ایک مساوات کی ذہنیت پیدا کرے، اور دوسرے مقام پہ اس کے خلاف کچھ کہے، قرآن ایسا کبھی نہیں کرے گا۔قرآن کریم نے کہا ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ باہمی پسندیدگی کا ہے۔اگر دونوں طرف سے کسی ایک میں بھی کسی قسم کی کراہت آ گئی تو فریق مقابل دوسرے کے لیے حرام ہو جائے گا(4:19)۔ازدواج کا باہمی رشتہ رفاقت کا ہے، مؤدت وسکینت اور رحمت کا ہے، اس لئے قرآن کہتا ہے کہ دونوں کے حقوق مساوی ہیں تو وہ شوہر کو مار پیٹ کا اختیار کیسے دے سکتا ہے؟ اس آیت میں میاں بیوی کا تو ذکر ہی نہیں ہے، ذکر ہے تو الرجال اور النسآء کا ہے۔میاں بیوی کا ذکر اگلی سورہ النساء کی ایک آیت میں آ رہا ہے، جس کا حوالہ چوہدری صاحب نے اپنے خط میں دے کر امتیازی سزا کی نشاندہی کی ہے۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ باہمی پسندیدگی کا ہے۔اگر دونوں طرف سے کسی ایک میں بھی کسی قسم کی کراہت آ گئی تو فریق مقابل دوسرے کے لیے حرام ہو جائے گا(4:19)۔ازدواج کا باہمی رشتہ رفاقت کا ہے، مؤدت وسکینت اور رحمت کا ہے، اس لئے قرآن کہتا ہے کہ دونوں کے حقوق مساوی ہیں تو وہ شوہر کو مار پیٹ کا اختیار کیسے دے سکتا ہے؟

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا (4:128)

اور اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی طرف سے سرکشی یا بے رغبتی محسوس کرے، تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ جن شرائط پر چاہیں، آپس میں مصالحت کر لیں۔مصالحت بہرحال بہتر ہے۔

مرد کی طرف سے سرکشی کا اندیشہ ہو تو اس کا حل:

آیت (4:34) میں کہا تھا کہ اگر تمہیں عورتوں کی طرف سے سرکشی کا اندیشہ ہو، تو اس کو آیت (4:35) کے مطابق حل کر لیا کرو۔زیرِ غور آیت میں ہے کہ:

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا (4:128)

''اگر خاوند کی طرف سے سرکشی کا، بے رغبتی کا اندیشہ ہو'' تو اس کو بھی آیت (4:35) میں دی گئی ہدایات کے مطابق حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

میاں بیوی کے درمیان مصالحتی کوششوں کی اہمیت:

اُوپر کی آیت 128 میں تو شوہر کے نشوز کی بات ہو رہی تھی، لیکن درجِ ذیل آیت (4:35) میں نشوز کی جگہ شقاق لا کر دونوں میاں بیوی کے ساتھ ایک جیسا سلوک روا رکھنے کی ہدایت دے کر معاملہ کو واضح کر دیا ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا (4:35)

معاشرے سے کہا جا رہا ہے کہ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا (4:35) ''جب بھی تمہیں احساس ہو کہ میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہو رہے ہیں'' تو فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا (4:35) ''تم ثالثی کرنے کے لیے ایک نمائندہ، بیوی کے خاندان سے، اور ایک نمائندہ خاوند کے خاندان سے مقرر کرو۔ اگر حکومتی ڈھانچہ نہیں ہے، تو ثالثی مقرر کرنے والا معاشرے کا سردار ہو سکتا ہے، اور اگر حکومت موجود ہے تو عدالت ثالث مقرر کر سکتی ہے، تاکہ یہ غیر جذباتی ماحول میں مصالحت کی کوئی راہ نکالیں حَکَم مصالحتی یا ثالثی نمائندے کو کہتے ہیں۔

آگے آیت ہے کہ

اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيۡنَهُمَا (4:35)

''اگر وہ (میاں بیوی) اور ثالث مصالحت کے ارادے سے کوشش کریں گے، تو خدا ایسی توفیق دے دے گا کہ کسی طرح نباہ ہو جائے''یعنی خدا چاہتا ہے کہ مصالحت کی صورت پیدا ہو جائے۔ مخالفت میں میاں بیوی کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں، ان کو ٹھنڈا کرنے کے لئے خدا نے مصالحت کرانے کا طریقہ بتایا ہے۔ اگر تین ماہ کی مصالحتی کوششیں بے کار چلی جائیں، تو پھر عدالت طلاق کی توثیق کر دیتی ہے کہ یہ اب میاں بیوی نہیں رہے۔

ازدواجی زندگی کا ترجمہ ہی ''رفاقت کی زندگی'' ہے۔ اگر میاں بیوی میں رفاقت و مودت کے تعلقات پیدا نہ ہوں، تو اس سے بڑا عذاب اور کیا ہو سکتا ہے۔

درجِ بالا قرآنی آیات کی روشنی میں ہمیں نظر آ رہا ہے کہ:

1۔ جہاں الرجل اور النساء کا ذکر میاں بیوی کے طور پر نشوز کا آپس میں معاملہ ہے تو وہاں دونوں کے درمیان سورہ النساء کی قرآنی آیات نمبر 128 اور 35 کی روشنی میں صُلح کے اقدام لینے اور ناکامی کی صورت میں طلاق کا اعلان کرنے پر ختم ہو جاتا ہے۔

2۔ جہاں الرجل اور النساء کا ذکر بغیر کسی رشتہ کے بطور مُطلق مرد و زن ہو رہا ہے، تو وہاں اپنے فرضِ منصبی سے نشوز کے وقوع پذیر ہونے کی صورت میں دونوں مرد و زن کے لئے سورہ النساء کی قرآنی آیات نمبر 16 اور 34 کی روشنی میں بدنی سزا کا قانون نافذ کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔

لہٰذا یہ کہنا بجا ہو گا کہ نشوز کے وقوع پذیر ہونے پر مرد و عورت کو اُن کی حیثیت کے مطابق غیر امتیازی طور پر یکساں سلوک کی قرآن میں تجویز کی گئی ہے، لہٰذا اِس مسئلہ میں دونوں مرد و زن کی حیثیت یکساں ہے۔

The Human Self and Allah

Episode No. 11

By G. A. Parwez
(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

One by one,Islam destroyed the self-erected walls of colour, race, language and geographical boundaries (nations), and in this way placed the heavenly message of the unity of mankind in front of the world. According to it there is one and only one criterionfor the division of mankind i.e.*Eimaan* and *Kufr*. All those on planet earth who have accepted *Eimaan* belong to one *Millat*and those who deny this fact belong to another nation.

And when a *Momin* accepts this fact that there is no associate or partner with his Allah, then with this he also announces this truth that the nation establishing the government of Allah (without sharing in His Rule) should also be without associates in the human world. This is the reason why the Quran has called the *Jamaat* of *Momineen*as being superior and above all others (3:139).

Reflect closely on these four short verses of Surah *Akhlaas*, and see how by acceptance of the attributes of Allah what supreme principles are held within them for the practical life of the *JamaateMomineen*.

(1) The one nation of Islam, in which there should be no infiltration of any kind of sectarianism or division into parties; one centre and the focal point of this centre one *Jamaat*; one flame and circling around itthose selfless ones who are willing to laydown their lives.

(2) Such a nation which is not dependent on anyone else for the accomplishment of its aims and the establishment of its plans, instead the whole world should look to it for help and assistance.

(3) And then differentiation in this nation based on race and blood should be considereda false distinction – the criterion for differentiation among mankind should be*Eimaan* and *Taqwa* and nothing else.

(4) No nation in the world could equal this one *Millat*, this should be the most supreme and in front of everyone.

In light of these facts,one recitation of Surah *Ikhlas* should in practical termsproduce this effect. But just reflect on what our state is today? These sanctified verses of Surah*Ikhlas* are read in those same words even today, in which the Muslims of the era of Rasul-ullah recited them, but is it the case that the same outcome is also produced today which was established in that great time? Consider after all,why is there this difference? It is because today there are only Quranic words remaining in front of us, their spirit has vanished from our vision.

4 *KhalqandAmr* (Creating and Directing)

One fundamental trait of the personality is creation i.e. every developed self has an attribute that it should create.But consider, what are the stages of creation? An engineer wishes to construct a house. Its first stage is this that he forms the intention in his heart to construct a house, then he prepares a map in his mind, then he draws this map on a sheet of paper, then he constructs the house according to this map. The house appears before people at that point when it takes the form of a building made of bricks or stones.

4.1 Two Stages of Creation

But it is obvious that before coming into this concrete form, the map of the house was in the mind of the engineer and even before the map came into the mind, its intention was in his heart. Therefore, in the process of the construction of the house, one stage was that when that house was in the intention and knowledge of the engineer and the second stage was that when it came into concrete and visible form in front of the eyes. Though both these stages are continuous links in the construction of the house, it is apparent that from the viewpoint of its state and its nature there is a big difference between the two of them. The Western philosopher, Pringle Pattison, has complained that in the English language there is only one word i.e. creationfor these two stages whereas in the Arabic language there are separate words for each one of these two stages.The Quran has used these different words for the manifestation of these two stages. The first stage (when that thing to be created is formed in the stage of intention and knowledge, or you could say, when it does not yet appear ina tangible and visible form before our eyes) is called the domain of *Amr*. And the second stage (when that thing becomes visible in tangible form) is the sphere of *Khalq*. The Quran states:

> …Is it not His to create and to govern (Khalq and Amr)? (7:54)

By stating this, these two stages have been related to Allah i.e. everythingfrom its initial stage to the last stage comes into shape and is formed according to His law.

4.2 Literal Meaning

*Al-Amara-to*is the term used for those small stones which are placed in plains and deserts so that the limits of an area or the signs of apath can be determined from these. From this it is evident that in the word *Amr-un*the aspect of a sign, pointer or direction is prominent. In other words, we can say from this thatbefore 'being', everything is moving in the direction of 'becoming' i.e. that thing which has not yet come into being but is

progressingtowards that direction in which,having advanced further, it willadopt a specific shape and existence. This stage (when it is proceeding in the direction of becoming) is called the domain of *Amr*. Starting from the knowledge and intention of Allah all those stages are included in this up to when it isstill in a formlessstate. This is one meaning of *Amr*.

4.3 *Amr* and Law

An engineer imagines the idea of some machine. The meaning of this conception is that he makes a sketch in his mind that if the parts of this machine are like this, and if this kind of arrangement is put into it, then if it is put into motion with this type of power then that machine will begin to function, and from that these kinds of results will be achieved. It is obvious that in this creative action one item is that machine which exists in front of us in a solid shape and the second is that plan or law according to which this machine remains in operation. This plan or stage of this law is hidden from our eyes though we can estimate or find information about this machine through intellect and reasoning.

The situation which is that of a machine is the same state of all the things of the universe. In the existing system of the universe everything has been created according to a specific plan and is functioning according to a specific law. This part which is related to a plan or law is linked to the domain of *Amr*. At this point it is essential to further understand that we can comprehend this much as to under which law a certain thing moves and is effective, but we cannot say why only that law was made for itand why another law was not devised. This is called the *Mashe'at* of Allah i.e. keeping in view the whole of the universe, Allah made whatever type of law was deemed suitable. Our concern is with the 'how' of this, not with the 'why'. This is the reason why in some verses the word *Amr* also contains the meaning of order or decision.In other words, Allah's decision was like this, His command was like this. He made this law according to His decision,in the matter of which He possesses complete sovereignty. It is obvious from this that that part of the domain of *Amr* where laws are formed for the things of the universe is outside the sphere of limits of our intellect, although where this *Amr* manifests in the form of physical laws, we can determine these through our observation, study and reasoning. These are called the laws of nature. In order to understand this,we can say that the 'pre-natural' stage of the laws under which the things of the universe function, is called the laws of *Mashe'at*, and the stage after this,the laws of nature.

Just as in the outer universethere are Divine laws functioning, similarly in the human world every action produces its effect according to a specific law. Mankind receives these laws through *Wahi*, therefore the word *Amr* is sometimes also usedfor *Wahi*. This means that *Wahi* determines that direction, travelling according to which, the caravan of

humanity can reach its intended destination.

Keeping these different meanings of *Amr*before you, reflect on therelevantverses of the Quran and the truth will become apparent.

4.4 Be! and It Is (*Kun-Fa-Ya'koon*)

Let us first of all take the creative stage of 'pre-nature'. In many places of the Quran it is stated:

> Verily, when He intends a thing, His command is, 'Be', and it is! (36:82)

There are two issues here which require to be understood; one is that, after forming an intention Allah does not in actual fact say the word *Kun*(like us) – its meaning is that immediatelyalong with His intention the process of creation commences. The second is that *Fa-Ya'koon* does not mean that the moment Allah said *Kun* thatthat thing came into existence in its final form. In many places of the Quran this reality has been made clear that the evolutionary process is continuing in the universe and the schemes of Allah take a period of thousands and thousands of years from their starting point to reach the state of completion. Hence, *Kun-Fa-Ya'koon* means that together with the intention of Allah the creative programme of this thing commences, and its completion takes place later at its own time. What we have said about'by saying *Kun* the creative act of this thing commences and its completion takes place later in its own time'is stated according to the human concept of timein which there is a past, a present and a future time. With Allah these differentiations in time means nothing; in front of Him there is always an eternal now, therefore with Him there is no time differential between *Kun*and *Fa-Ya'koon*.

After creation, let us now come to the law. We have already stated that one stage of the Divine law is that where these laws are determined,and we can know nothing about this stage nor why these laws are of this type. The second stage is that in which these physical laws are implemented and actioned in the universe. The Quran has called this *Amr*also. In other words, the physical laws of the universe are also called the '*Amr* of Allah'. In Surah *Al-A'raf*it is stated:

> Your Sustainer is Allah, Who created the heavens and the earth in six stages (which occurred in succession one after the other), then He established Himself on the (Throne) of authority: He draws the night as a veil over the day, each seeking the other in rapid succession: He created the sun, the moon, and the stars, (all) governed by laws under His command (His Amr). Is it not His to create and govern? (Khalq and Amr). Blessed be Allah, the Cherisher and Sustainer of the worlds! (7:54) See also (16:12)

In Surah *Ar-Rum*:

> And among His signs is this, that heaven and earth stand by His command (Amr)... (30:25)

4.5 Allah's *Amr* in the Heavens and the Earth

Not only are the earth and various planets establishedas a result of His *Amr* but He has instilled these properties in them so that they continue to carry out thetasks assigned to them according to a defined procedure:

> So He completed them as seven firmaments in two stagesand He assigned to each heaven its duty (Wahi) and command (Amr)...(41:12)

All the manifestations of nature are busy in the deliverance of their duty according to this very *Amr*. Ships floatabout on the surface of the oceans according to this same system (22:65). Winds blow all around according to it so that they can assist these vessels in travellinghither and thither (30:46, 45:12).

4.6 Management of Affairs

Once He had created these characteristics in all things,that Sovereign of '*Khalq* and *Amr*' has not (Allah forbid) sat back and suspended His creative activity, but even after the creation of the universe the 'management of affairs' continues unabated, and this process is being accomplished from the same centre of power and authority (throne of supreme power). The Quran declares, ask them:

> Say:...and Who is it that rules and regulates all affairs?... (10:31)

And replies:

> Verily your Sustainer is Allah, Who created the heavens and the earth in six stages, then He established Himself on the throne (of authority), regulating and governing things...(10:3) See also (13:2, 65:12)

The creative stages of the universe are mentioned in these two verses of Surah *Al-Sajda* in such a beautiful and balanced way that even the scientific discoveries of the modern time are enthralled by this. First it is stated that 'Allah passed this universe through six different stages to give it the present form' (32:4) and after this stated that Allah's pattern of creation is that in the domain of *Mashe'at* a scheme emerges. He begins the scheme of this *Mashe'at* from its lowest level; after this, traversing through various phasesaccording

to His '*Amr*', it continues to riseand progress towards its point of completion (35:10). The duration of these evolutionary stages is of thousands and thousands of years according to your calculation and estimate(32:5). (In fact, according to some schemes,fifty thousands of years (70:4)).

4.7 The *Amr*of Allah Always Returns to Him

Because all the concealed secrets of the 'system of *Amr*' are within the sphere of knowledge of that same Master of *Amr* and *Khalq*, therefore all the total affairs of the universe,having gained maturationunder thosebeneficial schemes, are gradually advancing towards that intended destination which has been determined for them:

> To Allah do belong the unseen (secrets) of the heavens and the earth, and to Him goes back every affair (for decision)...(11:123)

In the system of the universe, the sequence of events and occurrencesis established on this very pattern that every scheme reaches its destination stage by stage. The Quran states:

> ...that Allah might accomplish a matter already enacted.For to Allah do all questions go back (Amr). (8:44).

So that Allah may complete this *Amr* which is about to happen and all matters (after gaining maturation) return towards Allah's defined objective. See also (57:5). And then these matters are not such that a scheme was begun and then abandoned on the way and another thing was started, or that in some matters ultimatesuccess was achieved and in some others failure. Such things occur in human endeavours; the status of Allahis above and beyond this, His *Amr*is absolute, and His every scheme is assuredly successful:

> ...For Allah will surely accomplish His purpose (Amr): verily, for all things has Allah appointed a due proportion. (65:3)

> ...and Allah's Amr (command) must be fulfilled. (33:37) See also (4:47)

Indeed,Allah assuredly takes His *Amr* (scheme) to its final end; He has fixed a scale for everything because His every *Amr*is always accomplished.

Every *Amr* has to reach its objective (54:3). After traversing through various stages and objectives it has to realise a certain status at a defined place. To take these determined scales to their objectives all causes and effects are created, some of which can be grasped by the human intellect whereas some are beyond his understanding:

…And Allah has full power and control over His affairs; but most among mankind know it not. (12:21)

4.8 Allah's Chastisement is also Related to His *Amr*

In the same way that Allah's *Amr* (Divine law) is operating in the outer world, similarly the outcome of deeds is established in the human world according to His law (*Amr*) - the results of the deeds of individuals as well as those of nations. That which is commonly called reward and punishment is another name for the consequences of deeds according to the Law of Requital. When destruction falls upon nations as a resultof going against the Divine law, this is also termed as the *Amr*of Allah i.e. this tootakes place according to Allah's Law of Requital. The Quran has described the destruction and obliteration of past nations in these very words. At this point, a few examples are given as illustrations. For example, in relation to the flood of Noah his nation was told:

> Say: 'O my people! Do whatever you can: I will do (my part): but soon will you know – who it is to whom comes a penalty of ignominy, and on whom descends a penalty that abides.' (39:39-40)

> …then when comes Our command (Amr), and fountains of the earth gush forth…(23:27)

When the son of Noah said to his father that I will go to some mountain and take refuge, his father informed him:

> The son replied: 'I will betake myself to some mountain: it will save me from the water'. Noah said: 'This day nothing can save from the command (Amr) of Allah, any but those on whom He has mercy'…(11:43)

And when the time came for the cessation of this destructive flood, it was commanded:

> …And the water abated and the Amr (command) was ended…(11:44)

In relation to the destruction of the nation of *Ad* it was stated:

> So when Our decree issued (Amr arrived)…(11:58)

The same was also stated about the people of *Thamud*:

> When Our Amr came…(11:66)

Lot was provided with knowledge about this *Amr*:

And We made known this decree (Amr) to him, that the last remnants of those (criminals) should be cut off by tomorrow. (15:66)

The punishment which overwhelmed the nation of Shoaib was also called Allah's *Amr*:

When Our Amr was issued…(11:94)

When Bani Israel commencedworshipping of the calf in the absence of Moses, he said on his return:

…did you make haste to bring on the judgment (Amr) of your Sustainer? (7:150)

Regarding the hypocrites of the time of Rasul-ullah, it is stated:

…perhaps Allah will give victory, or a decision according to His Will (Amr). Then they will repent of the thoughts which they secretly harboured in their hearts. (5:52)

About the people of the Book, it is stated:

…But forgive and overlook, till Allah accomplishes His purpose (Allah's Amr arrives): for Allah has power over all things. (2:109)

Allah's law is that whatever kind of tree the seed is of, that same tree will grow from it, and from this tree those same type of flowers and fruit will appear. It is obvious that to make the seed grow into a tree and for the tree to bear its fruit,many forces of nature arefunctioning through mutual cooperation. Man has acquired knowledge of many forces among these, while some are such towards which his human mind has not yet reached. It may be that there are some effects among them whose reality and form are beyond the limits of the comprehension of man. Those forces which cause the Divine law to be productive are called *Malaika* in Quranic terminology.

4.9 *Malaika* **and Allah's** *Amr*

The Quran has stated about the *Malaika* that they carry out every task according to the *Amr* of Allah.

…and they act (in all things) by His command (Amr). (21:27)

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان وکائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.75
ISSUE
10

Monthly **TOLU-E-ISLAM**

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam